MAUL - 609

ایم.اے.اُردو

سمسٹر چہارم

MASTER OF ARTS (URDU)

FOURTH SEMESTER

غیر افسانوی نثر-۲

GHAIR AFSANVI NASR - 2

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

ایم.اے.اُردو

MASTER OF ARTS (URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹر چہارم

FOURTH SEMESTER

ایم.اے.یو.ایل – ۶۰۹ – غیرافسانوی نثر-۲

MAUL - 609 - GHAIR AFSANVI NASR - 2

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:

پروفیسر او. پی. ایس. نیگی، وائس چانسلر، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:

پروفیسر رینو پرکاش، ڈائریکٹر اسکول آف ہیومنٹیز، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی (UOU)، ہلدوانی۔

پروفیسر توقیر احمد خاں، ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

پروفیسر سید محمد ارشد رضوی، گورنمنٹ رضا پی. جی. کالج، رام پور، اُتر پردیش۔

ڈاکٹر شہپر شریف، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

محمد افضل حسین، اسسٹنٹ پروفیسر و کورس کوآرڈِنیٹر شعبۂ اُردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

کھیم راج بھٹ، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈِنیٹر و ایڈیٹر:

محمد افضل حسین (اُستاؔد بریلوی)، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

© جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب ''اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے ایم. اے. اُردو سالِ دوم، سمسٹر چہارم، غیر افسانوی نثر-۲ کے نصاب کا جز و ہے۔ مزید معلومات کے لئے یونی ورسٹی حکام یا صدرِ شعبۂ اردو سے یونی ورسٹی کے حسبِ ذیل پتے یا ای-میل پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

ای-میل: ahusain@uou.ac.in (محمد افضل حسین)، sshareef@uou.ac.in (ڈاکٹر شہپر شریف)

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (Teenpani Bypass)

HALDWANI-263139 Phone:05946-261122

MAUL – 609 - GHAIR AFSANVI NASR - 2

Board of Studies

Prof. Om Prakash Singh Negi
Vice Chancellor,
Uttarkhand Open University, Haldwani

Prof. Renu Prakash
Director, School of Humanities,
Uttarkhand Open University, Haldwani

Prof. Tauqeer Ahmad Khan
Rtd. Professor, Department of Urdu
University of Delhi, New Delhi

Prof. Syed Mohammad Arshad Rizvi
Department of Urdu,
Govt. Raza Post Graduate College, Rampur

Mohammad Afzal Husain
Head, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Dr. Shahpar Shareef
Assistant Professor, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Registrar

Shri Khemraj Bhatt
Uttarkhand Open University,
Teen Pani By-pass Road, Haldwani - 263139

Programme Coordinator

Mohammad Afzal Husain
Head, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Cover Page Design and Format Editing

Dr. Shahpar Shareef
Assistant Professor, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Unit Writers	Unit No.	Unit Writers	Unit No.
Dr. Ahmad Tariq	**UNIT – 01**	**Mohammad Afzal Husain**	**UNIT - 05**
Dr. Ahmad Tariq	**UNIT - 02**	**Mohammad Afzal Husain**	**UNIT – 06**
Dr. Riyaaz Ahmad	**UNIT - 03**	**Prof. Nomaan Khan**	**UNIT – 07**
Dr. Riyaaz Ahmad	**UNIT - 04**	**Prof. Nomaan Khan**	**UNIT - 08**

Editors

Mohammad Afzal Husain, Head, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani
Dr Shahpar Shareef, Assistant Professor, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani
Ghulam Jilani, Assistant Professor, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani
Mohammad Salim, Assistant Professor, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani
Shane Ali, Assistant Professor, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani

پیش لفظ

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا قیام اُتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے آبادی کے بڑے حصے کے ایسے اَفراد کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجوں یا یونی ورسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''ماسٹر آف آرٹ'' کے تحت ''ایم.اے.اردو'' کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایم.اے.اردو سالِ دوم، سمسٹر چہارم، غیر افسانوی نثر-۲ کے نصاب کا جزو ہے۔ یہ کتاب ۸/ اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق کی شکل میں ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی نظامِ تعلیم کی کتابوں کو {خود تدریسی مواد {SLM}(Self Learning Material) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اِسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں ہوگا۔ اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں اپنی اور استاد کی موجودگی کا احساس ہو سکے۔ اِسی لئے ہر اکائی کا آغاز ''اغراض و مقاصد'' سے کیا گیا ہے تاکہ آپ کو اِس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد ''تمہید'' دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تاکہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے، اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔ کتاب کے آخر میں اُن سوالات کے جوابات بھی دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کو حل کریں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تاکہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ بھی ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کی ''فرہنگ'' اور ''حوالہ جاتی کتب'' کی فہرست بھی دی گئی ہے تاکہ آپ اُن کتابوں کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔

ہم آپ کی کام یابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

ایم.اے.اُردو

(M.A.URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹر چہارم

FOURTH SEMESTER

ایم.اے.یو.ایل - ۶۰۹ - غیر افسانوی نثر-۲

MAUL - 609, GHAIR AFSANVI NASR - 2

اکائی نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
بلاک نمبر 01:			5
اکائی 1	سوانح نگاری کا فن	ڈاکٹر احمد طارق	6
اکائی 2	اُردو کے اہم سوانح نگار	ڈاکٹر احمد طارق	20
اکائی 3	خودنوشت سوانح کا فن	ڈاکٹر ریاض احمد	35
اکائی 4	خودنوشت سوانح نگار	ڈاکٹر ریاض احمد	51
بلاک نمبر 02:			69
اکائی 5	خاکہ نگاری کا فن	محمد افضل حسین	70
اکائی 6	اُردو کے اہم خاکہ نگار	محمد افضل حسین	81
اکائی 7	سفرنامہ کا فن	پروفیسر نعمان خاں	96
اکائی 8	اُردو کے اہم سفرنامہ نگار	پروفیسر نعمان خاں	109

بلاک نمبر 01

اکائی	01	سوانح نگاری کا فن	ڈاکٹر احمد طارق
اکائی	02	اُردو کے اہم سوانح نگار	ڈاکٹر احمد طارق
اکائی	03	خودنوشت سوانح کا فن	ڈاکٹر ریاض احمد
اکائی	04	خودنوشت سوانح نگار	ڈاکٹر ریاض احمد

اکائی 01 سوانح نگاری کا فن

ساخت

01.01 : اغراض ومقاصد

01.02 : تمہید

01.03 : سوانح نگاری کا پس منظر

01.04 : سوانح نگاری کا فن

01.05 : سوانح نگاری کی تعریف

01.06 : سوانح نگاری کے اصول ومسائل

01.07 : مواد کی فراہمی کے ذرائع

01.08 : خلاصہ

01.09 : فرہنگ

01.10 : سوالات

01.11 : حوالہ جاتی کتب

01.01 اغراض ومقاصد

اردو نثر کی تقریباً تمام مروّجہ اصناف مغربی زبان وادب کے مطالعے اوران سے استفادہ کے نتیجے میں ظہور میں آئیں۔ اپنی سہولت کے لیے ہم اردو کی نثری اصناف کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

﴿۱﴾ **افسانوی نثری ادب:** اس کے تحت ان تمام اصنافِ ادب کو شامل کیا جاتا ہے۔ جن کی بنیاد میں قصہ یا کہانی شامل ہوتی ہے۔ مثلاً ناول، افسانہ، اور ڈرامہ وغیرہ

﴿۲﴾ **غیر افسانوی نثری ادب:** اس کے تحت وہ تمام اصناف ادب شامل ہیں جن میں کہانی یا قصہ کا بیان نہیں ہوتا۔ مثلاً خاکہ، آپ بیتی، انشائیہ، سفرنامہ، رپورتاژ اور سوانح عمری وغیرہ۔

پیش نظر اکائی میں آپ غیر افسانوی نثری ادب میں سے ایک اہم صنف سوانح عمری کا مطالعہ کریں گے۔

اس کا مقصد طلبا کو سوانح نگاری کے فن، اصول ومسائل، اس کے پس منظر، نیز ابتدا اور اس کے فروغ وغیرہ سے واقف کرانا ہے۔

01.02 تمہید

اُردو ادب کی نثری اصناف میں سوانح نگاری ایک منفرد اور ممتاز صنف ادب کے درجہ رکھتی ہے۔سوانح نگاری کا رواج قدیم زمانے سے ہے۔لیکن قدیم زمانے میں حکمرانوں،قوم کے سور ماؤں یا بزرگوں کی سوانح عمری لکھنے کا رواج تھا اردو میں جدید طرز کی سوانح نگاری کا آغاز علی گڑھ تحریک سے وابستہ خواجہ الطاف حسین حالؔی اور مولانا شبلی نعمانی نے کیا۔ان بزرگوں نے فارسی اور انگریزی کے ادبیات میں رائج سوانح نگاری کی روایتوں اور فنّی اصولوں سے اِستفادہ کیا اور اردو میں پہلی مرتبہ جدید طرز کی سوانح عمری کے عمدہ نمونے پیش کئے۔سوانح نگار بالعموم سوانح عمری لکھنے کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کرتا ہے جس نے اپنی خدمات سے ملک وقوم کو فیض پہنچایا ہو یا انھوں نے علم وفن کے کسی شعبہ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں۔

سوانح عمری لکھنے کے لیے سب سے ضروری اور پہلا کام یہ ہے کہ سوانح نگار اپنے موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات تحقیق کر کے جمع کر لے۔پھر انھیں تنقید کے پیمانے پر پرکھ کر اس طرح ترتیب دے کر پیش کرے کہ صاحب سوانح کی پیدائش سے موت تک کے تمام اہم واقعات اور نمایاں کارنامے ایک فلم کی طرح نگاہوں کے سامنے آجائیں اور صاحب سوانح یا سوانح عمری کے ہیرو کی سیرت اور شخصیت کے تمام پہلو خوبیوں اور کمزوریوں یا محاسن ومعائب کے ساتھ اس طرح اُبھر کر سامنے آئیں کہ ہم اسے اپنے تصوّر میں چلتا پھرتا زندگی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہو دیکھ سکیں۔

01.03 سوانح نگاری کا پس منظر

انسان کو اپنے ماضی سے بہت دل چسپی ہوتی ہے۔اپنے بزرگوں کی یادگاروں کی طرح ان کے کارناموں کو جمع کر کے اپنے حافظے میں محفوظ رکھنے یا انھیں تحریری شکل دینے کا رواج زمانۂ قدیم سے قائم ہے۔جب انسان تحریر کے فن سے نا آشنا تھا اس زمانے میں اپنے مایہ ناز اَسلاف جن کے کارنامے پوری قوم کے لیے باعث فخر ہوتے تھے اور اپنے خاندانوں کے بزرگوں کے کارناموں کو گیتوں اور قصّوں کی شکل میں محفوظ کر کے سینہ بہ سینہ نسل در نسل ایک وِرثہ کے طور پر منتقل کیا جاتا تھا۔ان زبانی روایتوں کو ہم سوانح نگاری کی سمت میں پہلے قدم سے تعبیر کر سکتے ہیں فنِ تحریر کی ایجاد کے بعد قبیلے یا قوم کے سرداروں یا مذہبی بزرگوں کے کارناموں کو تحریری شکل میں محفوظ کیا جانے لگا۔مصر کے عظیم اہرام کی دیواروں پر جو عبارتیں کندہ کی گئی ہیں انھیں ہم تحریری شکل میں سوانح نگاری کے اوّلین نقوش کہا جا سکتا ہے۔

سوانح عمری لکھنے کا باضابطہ رواج سب سے پہلے یہودیوں کے ملتا ہے۔یہودیوں نے اپنے انبیا اور بزرگوں کے حالاتِ زندگی کو مربوط تحریری شکل میں محفوظ کرنے کا کام کیا اس کے بعد اہلِ روم نے سوانح نگاری کے فن کو فروغ دیا۔رفتہ رفتہ یہ طرز ساری دنیا میں مقبول ہو گیا۔زمانۂ قدیم میں صرف بادشاہوں اور حاکموں یا بزرگانِ دین یا قوم کے سورماؤں کی سوانح عمری لکھنے کا رواج تھا لیکن انیسویں صدی میں تعلیم کے فروغ کے سبب عوامی شعور بیدار ہوا۔مساوات کے تصوّر نے حاکم ومحکوم کے تصوّر پر کاری ضرب لگائی۔چناں چہ اب عام انسان جنھوں نے کسی شعبۂ حیات میں کمال حاصل کیا یا اپنی خدمات سے ملک وقوم کو فائدہ پہنچایا انھیں سوانح عمری لکھنے کے لیے منتخب کیا جانے لگا۔عربی اور فارسی میں تذکرہ نگاری اور سیرت نگاری کی شکل میں سوانح عمری لکھنے کا رواج زمانۂ قدیم سے تھا۔عربی اور فارسی کے زیرِ اثر اردو میں بھی بزرگانِ دین اور شعرا کے تذکرے لکھنے کا آغاز ہوا۔

اردو میں سوانح نگاری کا جدید تصوّر مغربی ادب سے واقفیت اور اِستفادہ کا نتیجہ ہے۔جدید طرز کی اوّلین سوانح عمریاں علی گڑھ تحریک سے وابستہ مولانا الطاف حسین حاؔلی اور مولانا شبلی نعماؔنی نے لکھیں۔جن میں سوانح عمری کے مغربی اصولوں کو برتنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔

01.04 سوانح نگاری کا فن

سوانح نگاری کا مطلب کسی شخص کی سوانح عمری یا زندگی کے حالات یعنی سرگزشتِ حیات کو دیانت داری کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لانا ہے۔لفظ''سوانح'' دراصل عربی زبان کے لفظ''سانحہ'' کی جمع ہے۔جس کے معنی ہیں واردات،واقعات،ناگوار قصّہ،ماجرا اور خوشگوار واقعہ وغیرہ۔لیکن عمومی طور پر لفظ'سانحہ' سے ناخوشگوار،ناپسندیدہ اور وحشت ناک واقعہ مراد لیا جاتا ہے لیکن سوانح نگاری یا سوانح عمری کی اصطلاح میں لفظ'سانحہ' کے لغوی معنی کو اختیار کیا گیا ہے۔چناں چہ سوانح عمری کا مطلب ہے کسی شخص کی سرگزشتِ حیات یا حالاتِ زندگی کا بیان جس میں اس شخص کی زندگی کے تلخ و شیریں واقعات وحادثات کے بیان کے ساتھ اس شخص کی شخصیت اور سیرت کا اچھے اور برے پہلو کا بیان بھی ہو۔اس کے علاوہ اپنی زندگی میں اس شخص نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں اور جن ناکامیوں کا سامنا کیا ہے انھیں سوانح عمری میں تفصیل پیش کی جائے۔تاکہ قارئین اس شخص کی سوانح عمری کا مطالعہ کرکے اس کی سیرت وشخصیت اور اس کی کامیابی اور ناکامیوں سے واقفیت حاصل کرسکیں۔

سوانح عمری کو انگریزی زبان میں (Biography) کہتے ہیں۔اس میں'Bio' کے معنی ہیں زندگی یا حیات اور'Graphy' کے معنی ہیں نگاری یعنی تحریری شکل میں بیان کرنا۔چناں چہ انگریزی زبان کا لفظ (Biography) کا مطلب ہوا رودادِ حیات یا حالاتِ زندگی کو قلم بند کرنا۔کسی شخص کی سوانح عمری کے ضبطِ تحریر میں آنے کے دو طریقے ہیں۔پہلا یہ کہ کوئی شخص اپنی سرگزشتِ حیات قلم بند کرلے۔اسے آپ بیتی یا خودنوشت سوانح عمری (Auto-Biography) کہتے ہیں دوسرا طریقہ سوانح عمری کے وجود میں آنے کا یہ ہے کی ایک شخص کی زندگی کے حالات کو جمع کرکے کوئی دوسرا شخص اس کی سوانح عمری تحریر کرے۔اسے سوانح حیات یا سوانح عمری کہتے ہیں۔سوانح عمری تحریر کرنے کے عمل کو سوانح نگاری کہا جاتا ہے۔

01.05 سوانح نگاری کی تعریف

مختلف ماہرین نے سوانح نگاری کی تعریف مختلف طریقوں سے بیان کی ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا (EncyclopediaBritannica) میں سوانح عمری کی تعریف ان الفاظ میں درج ہے:

''سوانح عمری ایک ایسا بیانیہ ہے جو کسی فرد کی زندگی اور شخصیت کی بازآفرینی اور اس کے عمل کو شعوری اور فن کارانہ انداز میں قلم بند کرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔''

سوانح عمری کی مندرجہ بالا تعریف میں سوانح عمری میں ادبی حُسن کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔جس کے بغیر سوانح عمری واقعات کی کھتونی بن کر رہ جائے گی۔انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا (Encyclopædia Britannica) میں سوانح عمری کے تحت درج کیا گیا ہے کہ:

''سوانح عمری کسی شخص کی حقیقی زندگی کا حساب وکتاب ہے۔''

مندرجہ بالاتعریف میں سوانح عمری کے تاریخی پہلو کو مدنظر رکھا گیا ہے کہ تاریخ نگاری کی طرح سوانح نگاری میں بھی سوانح نگار کو واقعات کوتحقیق وتنقید کی کسوٹی پر پرکھ کرصداقت اور دیانت داری کے ساتھ ان کا بیان کرنا چاہیے۔

چیمبرس انسائیکلوپیڈیا میں سوانح نگاری کی تعریف ان الفاظ میں درج ہے کہ:

''سوانح حیات کسی مخصوص فرد کی زندگی اور کردار کے مسلسل بیان فن کارانہ اظہار ہوتا ہے۔اس میں یہ اضافہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ سوانح عمری سے زیادہ دل چسپ شعبہ ادب میں نہیں ہوتا۔نیز یہ کہ نوعِ انسانی کا دل کش ترین مرکزِ مطالعہ ہمیشہ سے انسان رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔''

چیمبرس انسائیکلوپیڈیا کی مندرجہ بالاتعریف میں جو نکات پر زور دیا گیا ہے۔ان میں پہلا یہ ہے کہ سوانح نگاری دراصل کسی شخص کی سرگزشتِ حیات کا فنکارانہ بیان ہے دوسرے یہ کہ پیرایۂ بیان پرلطف اور دل چسپ ہو۔اس میں ہم یہ اضافہ بھی کرسکتے ہیں کہ مندرجہ بالا تعریف کے مطابق سوانح عمری ادب کا ایک ایسا شعبہ ہے جس میں مختلف اصناف کی خصوصیات سمٹ آتی ہیں۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں سوانح عمری کے تحت درج کیا گیا ہے کہ:

''سوانح عمری بہ طورادب کی ایک شاخ کے افراد کی زندگیوں کی تاریخ ہے۔''

مندرجہ بالاتعریف میں سوانح عمری کے ادبی اور تاریخی پہلو کوملحوظ رکھا گیا ہے۔

(Cassell's Encyclopedia ofLiterature) میں سوانح عمری کی تعریف کوتفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

''سوانح عمری تاریخ کی ایک شاخ ہوتی ہے۔اس کا مقصد جہاں تک ہوسکے دیانت داری کے ساتھ کسی فرد کی زندگی کا بیان ہوتا ہے۔سوانح نگار کا فرض یہ ہے کہ وہ مؤرّخ اور مصوّر دونوں حیثیتوں سے کام کرے۔مصوّر کا فرض کیا ہوتا ہے؟ تصویر سازی کے لیے بیٹھنے والے شخص کی ایسی شبیہ تیار کرنا جو نہ صرف اس سے ملتی جلتی ہو بلکہ فن کا نمونہ بھی ہو۔اور مؤرّخ کا فرض کیا ہے؟ ٹھیک ٹھیک باتیں بیان کرنا اور حقائق کو قابل فہم انداز سے ترتیب دینا۔حقائق کی محض فہرست مرتب کردینا جس میں فنکاری نہ ہو۔تاریخ ہی ہے نہ سوانح عمری؟''

درج بالاتعریف میں اہم نکات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ اس طرح ہیں:

﴿۱﴾ سوانح نگاری ایک ایسا فن ہے جس کا تعلق براہِ راست تاریخ نگاری سے ہے۔

﴿۲﴾ سوانح نگاری درحقیقت تاریخ کی ایک شاخ ہے اس لیے تاریخ نویسی کی طرح سوانح نگاری میں بھی غیر جانب داری، صداقت اور دیانت داری ضروری ہے۔

﴿۳﴾ سوانح نگار کو ادبی اور فنّی قدروں کا پاس ولحاظ رکھنا چاہئے تا کہ سوانح عمری کا ادبی حُسن مجروح نہ ہونے پائے۔

انگریزی ادب میں ڈرائیڈن پہلا شخص ہے جس نے سوانح عمری کی تعریف متعیّن کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈرائیڈن کے مطابق:

''کسی خاص شخص کی زندگی کی تاریخ سوانح عمری ہے۔''

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ڈرائیڈن نے بھی اپنی تعریف میں سوانح نگاری کے لیے تاریخ نویسی کے اصولوں میں شامل کر رکھا ہے۔

جب کہ معروف انگریزی ادیب جانسن کے مطابق:

''سوانح عمری بیانیہ تحریر کی مختلف اقسام میں سے ایک ہے۔ یہ نہایت شوق سے پڑھی جاتی ہے اور نہایت آسانی کے ساتھ زندگی کے مقاصد پر اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔''

اُردو زبان میں بھی ادیبوں اور ناقدوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے سوانح عمری کی تعریف متعیّن کرنے کی کوشش کی ہے اور اس صنف سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی سوانح عمری کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کسی بھی بڑے انسان کی سوانح عمری تنہا اس کی سوانح عمری نہیں ہوتی۔ اس کا ماحول اور اس کے ماحول سے وابستہ بہت سے افراد اور اشخاص بھی اپنے ذہن اور زندگی کے اعتبار سے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک سوانح عمری کا مطالعہ ہم کر سکتے ہیں کہ کسی ایک انسان کی ہی زندگی کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ اس سے وابستہ بہت سے پہلوؤں کا مطالعہ ہے جس میں تاریخ و تہذیب دونوں سمٹ آتے ہیں۔''

مشہور نقاد شمس الرحمٰن سوانح عمری کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''سوانح عمری صاحب سوانح کی شخصیت کے تمام اہم پہلوؤں کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہے اور صاحب سوانح کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں ہماری معاون ہوتی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کوئی ایک سوانح حیات صاحبِ سوانح کی مکمل ذہنی اور تاریخی تصویر پیش کر سکتی ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اچھی سوانح عمری ہمیں صاحبِ سوانح اس قدر قریب کر دیتی ہے کہ اتنی قربت شاید ذاتی ملاقاتوں سے نہ حاصل ہو۔''

سوانح عمری کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف تقریباً تمام ماہرین ادب نے کیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین سوانح عمری کی ضخامت کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس میں کسی شخص کے حالاتِ زندگی اور شخصیت کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ یہ ایک مختصر مضمون بھی ہو سکتا ہے، پوری کتاب بھی۔''

ڈاکٹر گیان چند جین نے سوانح عمری کی ضخامت کے متعلق جو خیال ظاہر کیا ہے اس کے مطابق سوانح عمری کی ضخامت کے متعلق کوئی میعاد مقرّر نہیں ہے چناں چہ چند صفحات پر مشتمل ایک مضمون اور سیکڑوں صفحات کی ضخامت والی کتاب دونوں پر سوانح کا اطلاق ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب سوانح عمری کی تاریخی اور ادبی پہلو کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''سوانح، تاریخ کی ایک شاخ ہے لیکن بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کا شمار ادب میں بھی کیا جاتا ہے۔ اب سوانح محض انسان کی پیدائش، خاندان، تعلیم، مشاغل زندگی اور وفات کا ہی بیان نہیں بلکہ فرد کے ظاہر و باطن، عادات واَطوار، اخلاق و معاشرت، وراثت ونفسیاتی کیفیت اوراس کی زندگی کے نشیب وفراز کی داستان بن گئی ہے۔''

اس تعریف کے مطابق سوانح نگاری درحقیقت ادب اور تاریخ کا ایک خوب صورت امتزاج ہے۔اس میں ادبی اوصاف، بیان کی ندرت اوراثر آفرینی بھی ہوتی ہے اور تاریخ نویسی کے لیے مخصوص تحقیقی وتنقیدی بصیرت بھی۔

ڈاکٹر الطاف فاطمہ کے مطابق:

''سوانح نگاری کسی فرد واحد کی شخصیت کو منظر عام پر اس طرح لانے کا نام ہے کہ اس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے۔''

مندرجہ بالا تعریفوں کا مطالعہ کر کے ہم سوانح عمری کی تعریف اس طرح متعیّن کر سکتے ہیں کہ کرۂ ارض کے کسی خطے میں جنم لینے والے انسان پر اس سماج میں رائج تہذیبی، سماجی، اور مذہبی رُسوم ورواج کا جو اثر پڑتا ہے۔جس قسم کے ماحول میں اس کی تربیت ہوتی ہے اوراس کا شعور پروان چڑھتا ہے، اس کی سیرت وشخصیت ایک خاص سانچے میں ڈھلتی ہے۔جس کے زیر اثر وہ شخص اپنی زندگی میں مختلف اقسام کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔سوانح نگار ان تمام کوائف کو تاریخی ترتیب سے واقعات کی صحت کے ساتھ ادبی پیرائے میں بیان کرتا ہے تا کہ اس شخص کی ظاہر و باطن کی پوری تصویر قاری کی نگاہ کے سامنے آجائے۔مختصر طور پر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ سوانح عمری کسی شخص کی پیدائش سے موت تک کی ایک مکمل و مستند دستاویز ہے۔

سوانح عمری کسی شخص کی رودادِ حیات یا سرگزشتِ حیات ہوتی ہے۔اس کے آئینے میں ہم صاحبِ سوانح کی حیات کی بازیافت کے عمل سے گزرتے ہیں، ہم اس کی سرگرمیوں نیز ظاہر و باطن سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔سوانح عمری کے مطالعے سے ہمیں صاحبِ سوانح کے حالات زندگی کا ہی علم نہیں ہوتا بلکہ ہم اس کے عہد اوراس کے گرد وپیش جاری سرگرمیوں اور صاحب سوانح کے احباب، اعزّا اور متعلقین وغیرہ سے بھی واقفیت حاصل کرتے ہیں سوانح عمری کا موضوع کوئی شخص ہوتا ہے۔لیکن یہ سچ ہے کہ بالعموم ایسے لوگوں کی سوانح عمری لکھی جاتی ہے جنھوں نے زندگی اور سماج کے کسی شعبہ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں۔یا پھر انھوں نے اپنی زندگی کو ملک وقوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہو اپنے کارناموں کے سبب ایسے لوگ ملک وقوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔چناں چہ لوگوں میں ان کی زندگی کے حالات جاننے کی جستجو ہوتی ہے۔ایسی شخصیات اِکہری نہیں بلکہ ہمہ جہت ہوتی ہیں اوران کی زندگی کئی پہلو ہوتے ہیں۔چناں چہ سوانح نگار میں اتنا تحقیقی وتنقیدی شعور ہونا چاہیے کہ وہ ایسی شخصیات کے متعلق غیر جانب دار رہ کر حقائق پر مبنی مواد جمع کر سکے۔اور انھیں مناسب ترتیب کے ساتھ پیش بھی

کر سکے۔ نیز وہ جمع شدہ مواد کی مدد سے صاحب سوانح کی شخصیت کے ظاہر و باطن کا تجزیہ کر کے اس احساس اور شعور تک رسائی حاصل کر سکے۔ کیوں کہ انسان کی ظاہری شخصیت محض ایک خول ہوتی ہے۔ اصل اور حقیقی شخصیت انسان کا باطن ہوتا ہے۔ ظاہری شخصیت انسان کے باطن کے لیے نقاب بن جاتی ہے اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

سوانح نگاری کا موضوع انسان ہے چناں چہ صاحب سوانح کے علمی، فکری، معاشی، سماجی اور سیاسی مقام و مرتبہ کا خیال ملحوظ رکھنا ضروری نہیں، کیوں کہ سوانح نگاری کے لے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ ایک معمولی اور عام انسان سے لے کر عظمت کی بلندیوں پر فائز ہونے والی شخصیات تک کوئی بھی شخص سوانح نگاری کا موضوع بن سکتا ہے۔ لیکن بالعموم ایسے لوگوں کو سوانح نگاری کے لیے منتخب کیا جاتا ہے جنہوں نے زندگی کے کسی شعبہ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں چناں چہ بالعموم سوانح نگاری کے لیے قومی رہنما، مذہبی شخصیت، ادیب و شاعر، سماجی خدمت گار وغیرہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ سوانح نگاری میں موضوع یعنی اس شخصیت کو بنیادی اہمیت حاص ہوتی ہے جسے سوانح نگار منتخب کرتا ہے۔ موضوع کے انتخاب میں سوانح نگار کو غیر جانب داری اور دیانت داری سے کام لینا چاہیے۔ سوانح نگار بالعموم ملک و قوم کے عظیم فرزندوں کو منتخب کرتا ہے چاہے ان کا تعلق زندگی اور سماج کے کسی بھی شعبہ سے ہو۔ کبھی کبھی سوانح نگار ایسی ہستیوں کو بھی اپنا موضوع منتخب کر لیتا ہے جن سے اس کا کسی قسم کا کوئی تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً باپ، بیٹا یا استاد وغیرہ۔ اسی طرح کبھی کبھی نام و نمود یا کسی منصب کے حصول کے لیے بھی سوانح نگاری کا موضوع انتخاب کر لیا جاتا ہے۔ لیکن ایسی سوانح عمریاں غیر جانب داری اور ایمان داری کا نمونہ نہیں ہوتیں۔ ایسی سوانح عمریوں میں منتخب شخصیات کو عظیم ثابت کرنے کے لیے ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے ہیں۔ اس عمل سے صداقت مجروح ہوتی ہے۔ ایسی سوانح عمریاں درحقیقت سوانح عمریوں کی صف میں جگہ پانے کی مستحق نہیں ہوتیں۔

انسانی سماج میں زندگی گزارنے والا فرد سماجی قوانین کی پاس داری کرنے کے باوجود اپنے ذاتی عقائد و توہّمات اور تعصّبات و ترجیحات کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ اگر سوانح نگار صاحب سوانح عقائد و توہمات اور انفرادی نظریات سے اختلاف رکھتا ہے تو ایسی سوانح عمریوں میں جانب داری کا عنصر حاوی ہو جاتا ہے اور صاحب سوانح کی شخصیت و سیرت کے اچھے پہلو بھی نقطۂ نظر کے ختلاف کے باعث سوانح نگار کی نظر میں عیب بن جاتے ہیں۔ کیوں کہ جب کوئی سوانح نگار اپنے مخصوص اور اپنے مخصوص عقائد و نظریات کی کسوٹی پر صاحب سوانح کو پرکھتا ہے تو اس جانچ پرکھ میں اختلاف کے ہزار پہلو نکلتے ہیں اس کی عبرت ناک مثالیں یورپی مصنفین کی تصنیف کردہ وہ کتابیں جن میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور دیگر اکابرین کا ذکر انھوں نے اپنے عقائد و نظریات کی روشنی میں کیا ہے، چناں چہ وہ اپنے موضوع سے انصاف نہیں کر سکے۔ اس کی اصل وجہ عیسائی مصنفین کا مذہبِ اسلام کے خلاف تعصّب ہے اگر اپنے موضوع سے سوانح نگار کی ذہنی مطابقت ہے اور سوانح نگار فن سوانح نگاری کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھتا ہے تو اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ ایک اچھی سوانح عمری وجود میں آئے گی۔ بصورت دیگر ذہنی مناسبت نہ ہونے کا باعث یہ امکان بہر حال رہتا ہے کہ سوانح نگار صاحب سوانح کی سیرت و شخصیت کے کسی اہم رُخ کو بھی عدمِ دل چسپی کی بنا پر خاطر خواہ اہمیت نہ دے کر نظر انداز کر دے۔ غرض کہ سوانح نگار کو اپنے موضوع سے ذہنی مناسبت و مطابقت کے علاوہ اس سے دل چسپی اور ہمدردی بھی ضروری ہے۔ دنیا کی بہترین سوانح عمریاں ایسے مصنّفین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں جنھیں اپنے موضوع سے دل چسپی اور ہمدردی تھی۔ عہدِ قدیم میں صرف مذہبی اکابرین یا حکمرانوں کی سوانح عمری لکھنے کا رواج تھا۔ لیکن عہدِ جدید میں جمہوری نظام کے فروغ،

تعلیم کی اشاعت اوراخبارات ورسائل کی مقبولیت کےعوام کے رجحان اوردل چسپی میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔ چناں چہ سوانح نگاری کا دائرہ وسیع ہوا۔ اور مذہبی و سیاسی قائدین کے ساتھ مختلف علوم وفنون میں نمایاں کارنامے انجام دینے والے افراد کے ساتھ عام انسان بھی سوانح عمری کا موضوع بن چکا ہے۔

01.06 سوانح نگاری کے اصول ومسائل

سوانح نگاری کا مطلب کسی شخص کی زندگی میں پیش آنا حادثات وواقعات اوراس کی کامیابیوں اورناکامیوں کی صرف تفصیلی بیان ہی نہیں ہے۔ سوانح نگاری کا گہرا تعلق ادب سے ہے لہٰذا سوانح نگاری ایک تخلیقی عمل ہے۔ سوانح نگاری میں تخلیقی عناصر کی کارفرمائی، جمالیاتی حُسن کی آمیزش اورادبی اقدار کی شمولیت کی وجہ سے فن ادب کا اہم جُزؤ ہے۔ سوانح عمری چوں کہ اصناف ادب میں ایک اہم صنف کی حیثیت سے شمار ہوتی ہے لہٰذا سوانح نگاری میں فن اورادب کے تقاضوں کوملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ماہرین ادبیات نے سوانح نگاری ادبی حیثیت واہمیت کا تعین کرنے کے لئے تین عناصر کی نشاندہی کی ہے جوحسب حال مذکور ہیں۔

﴿۱﴾ موضوع ﴿۲﴾ مواد ﴿۳﴾ اسلوب

دنیا کی تمام زبانوں میں لکھی گئیں تمام سوانح عمریوں میں ان تین عناصر کا امتزاج نظر آتا ہے۔ سوانح نگاری ایک قسم کا تخلیقی عمل ہے لیکن دیگر ادبی اصناف کے برعکس یہ عمل شعوری ہے۔ سوانح نگاری شعوری عمل اس لئے ہے کہ سوانح نگار کوغور وفکر کے بعد موضوع کا انتخاب کرنا پڑتا ہے، اوراس کے متعلق مواد تک رسائی حاصل کر کے اسے جمع کرنا پڑتا ہے۔ پھراس مواد کو تحقیقی وتاریخی اصول وضوابط پر پرکھ کر واقعات کو منطقی ترتیب میں ادبی فن کوملحوظ رکھتے ہوئے پرونا پڑتا ہے۔ غرض کہ موضوع کے انتخاب سے لے کر مواد کی فراہمی اوراسے منظّم انداز میں پیش کرنے تک تحقیق، تنقید اور تخلیق کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سوانح عمری میں ادبی حُسن ہوتا ہے مگر سوانح عمری اور دیگر اصناف ادب کی اہمیت میں خاصا فرق ہے۔ کیوں کہ سوانح عمری بہرحال جذبات واحساسات اورمشاہدات ونظریات کا خالص ادبی بیان نہیں بلکہ اس بیان میں تنقید وتحقیق کا عنصر اسے دیگر اصنافِ ادب سے ایک الگ شناخت عطا کرتا ہے۔ چناں چہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوانح عمری کا ادبی حُسن تحقیق وتنقید کی آمیزش سے تشکیل پاتا ہے۔

انسانی زندگی اس کرۂ ارض پر پیدائش سے موت تک دراصل واقعات کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ زندگی میں رونما ہونے والے ہر واقعات کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ ہر واقعہ ہمارے لیے خوشی یا رنج کا باعث ہوتا ہے۔ غرض کہ انسانی زندگی کا حُسن، اُمنگ، آرزو یا اُداسی ان واقعات کی ہی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ لیکن سوانح نگاری کے نقطۂ نظر سے تمام واقعات اہم نہیں ہوتے۔ سوانح نگار کو واقعات کے ڈھیر کو کھنگالنا پڑتا ہے اورایسے واقعات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جن سے صاحب سوانح کی شخصیت اورسیرت پر روشنی پڑ سکے۔ واقعات کے ڈھیر میں وہ واقعات بہت اہم ہوتے ہیں جوانسان کی زندگی میں تبدیلیاں لاتے ہیں اورزندگی کوایک نئی سمت عطا کرتے ہیں۔ سوانح نگار کے لئے وہی واقعات اہم ہیں جن سے صاحب سوانح کی شخصیت کے خدوخال واضح طور پر اُبھر سکیں۔ چاہے وہ واقعات عام نقطۂ نظر سے کتنے غیر اہم کیوں نہ ہوں۔ چونکہ سوانح عمری کسی شخص کی زندگی اوراس کے کارناموں کی بازیافت کا عمل ہے۔ لہٰذا محض واقعات کا بیان ہی فنی اعتبار سے کافی نہیں ہوتا۔ دراصل واقعات کی تحقیق، ان کی کتر بیونت یا کانٹ چھانٹ سوانح نگاری کے فن کا اہم مسئلہ ہے۔

انسان کی اپنے سماجی وتہذیبی اقدار وروایات سے جوٹکراؤ ہوتا ہے،سوانح نگاری میں اس کا بھر پر اظہار ہونا چاہیے۔کیوں کہ اس کے بغیر کسی انسان کی شخصیت پہ مکمل روشنی نہیں پڑتی۔اس کے علاوہ سوانح نگار کوان تمام عناصر پرتوجّہ دینی چاہیے جن کی مدد سے شخصیت کی تعمیر اور تکمیل کے سامان فراہم ہوتے ہیں۔اس سلسلے میں خارجی حالات کے ساتھ ساتھ صاحب سوانح کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیت کا تجزیہ بہت ضروری ہے۔انسانی شخصیت اکہری نہیں ہوتی بلکہ اس کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔تمام انسانی خوبیوں اور خامیوں یا اچھائیوں اور برائیوں کا پیکر ہوتے ہیں۔چناں چہ سوانح نگاری میں انسانی شخصیت کے کمزور پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالنی چاہیے،جن سے انسان کی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔سوانح نگار کوعلم نفسیات کے اصولوں کو بروئے کار لا کر صاحب سوانح کی ذہنی اوراورنفسیاتی کیفیت تک رسائی حاصل کر کے اس کے باطن کے پیچ وخم کا سراغ لگانا چاہیے۔پھر جونتیجہ برآمد ہوا سے بے کم وکاست و بے باکی اور دیانت داری سے بیان کر دینا چاہیے۔یک رُخی سوانح عمری جس میں صرف مدّاحی ہوفنی اعتبار سے کمزور ہوتی ہے۔سوانح نگار کی صاحب سوانح سے کسی قسم کی قربت یا تعلق سوانح نگاری کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔صاحب سوانح کے تیئں عقیدت واحترام کا جذبہ اس کی ذات کے اس پہلو کو ہمیشہ نظرانداز کر دیتا ہے جو شخصیت کا کمزور پہلو ہوتا ہے۔سوانح عمری میں شخصیت کے کسی پہلو کو بھی،خواہ وہ کتنا ہی کمزور ہو،بر بنائے مصلحت عوام کی نگاہ سے پوشیدہ رکھنا انتہائی نا مناسب ہے۔کیوں کہ تصویر کو اصل سے زیادہ حسین بنانا یا اس کو زیادہ بدصورت بنا دینے کا عمل فنّی دیانت داری کے اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ڈاکٹر جانسن کے مطابق سوانح نگار کوصداقت،وضاحت اورنفسیاتی کیفیت پرتوجّہ دینی چاہیے۔

جولوگ عقیدت واحترام یا کسی قسم کے اختلاف کے سبب صداقت سے گریزاں ہوتے ہیں وہ یقیناً غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔در حقیقت صداقت ہی وہ عنصر ہے جوسوانح نگاری میں سوانح نگار کو ہرقسم کے الزام سے بچالیتا ہے۔اوراگر یہ عنصر سوانح عمری میں موجود نہ ہوتو ایسی سوانح عمری کا ہونا یا نہ ہونا ایک جیسا ہے۔سوانح نگار کوصاحب سوانح کی زندگی کے واقعات کا تجزیہ کر کے نتیجہ نکالنے کا حق حاصل ہے لیکن ان نتائج کی بنیاد پر اسے شخصیت وکردار کے متعلق کسی قسم کا فیصلہ صادر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔اچھا سوانح نگار اپنی مرضی سے تصویر نہیں بناتا بلکہ صاحب سوانح کی مکمل تصویر اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قارئین کے پیش کر دیتا ہے۔سوانح نگار کے پیشِ نظر صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ سوانح عمری میں ایسی فضا پیدا کی جائے کہ صاحب سوانح کی زندگی کا ارتقا اوراس کا نشیب وفراز واضح طور پر سامنے آسکیں۔

غرض کہ سوانح عمری میں صداقت اور دیانت داری کی بے حد اہمیت ہے۔اس کے ساتھ ہی خشک و بے رنگ واقعات میں دل چسپی پیدا کرنے کے لیے بیان اوراسلوب میں شگفتگی اور ندرت ضروری ہے جس کا تعلق براہ راست فن ادب سے ہے۔ادبی حُسن سوانح عمری میں دل کشی اور دل چسپی پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔سوانح عمری میں تاریخی،فرد کی سیرت وشخصیت اورادب کی چاشنی،چاروں عناصر کی آمیزش سے ایک عمدہ مرکب تیار کیا جاتا ہے۔لیکن سوانح نگاری میں سوانح نگار کا اسلوب تخیلاتی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اسلوب میں زندگی کے واقعات، بیان کی تازگی اور شگفتگی سے ہم آمیز ہوتا ہے۔سوانح نگار کا اسلوب مہذب وشائستہ ہونا چاہیے۔کیوں کہ اسلوب کی شوخی بے احتیاطی کو جنم دے کر سوانح عمری کے معیار اور صاحب سوانح کے وقار کو مجروح کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

ماہرین ادب کے درمیان سوانح عمری کی ضخامت کے سلسلے میں اختلاف رائے موجود ہے۔مغربی سوانح نگار باسویل کا قول ہے کہ سوانح عمری کوطویل اور بھاری بھرکم ہونا چاہیے تاکہ انسان کی پوری زندگی کی پوری تصویر بن سکے۔جب کہ لٹن اسٹریچی کے مطابق سوانح عمری کوواقعات کی کھتونی نہیں ہونی چاہیے۔دراصل اسٹریچی سوانح عمری میں اختصار،حُسنِ انتخاب،غیر جانب داری،دیانت داری،حق گوئی اور آزادیِ خیال کے ساتھ ساتھ واقعات کی ترتیب میں ربط وتوازن کواہمیت دیتا ہے۔

01.07 مواد کی فراہمی کے ذرائع

کسی شخص کی سوانح عمری لکھنے کے لیے سب سے اہم مسئلہ مواد یعنی معلومات کی فراہمی ہے۔سوانح نگار کو اپنے موضوع کے انتخاب میں محتاط رہنا چاہیے۔اسے موضوع کے طور پر ایسے شخص کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے جن کے متعلق مواد دستیاب نہ ہو یا مواد کے حاصل کرنے میں دشواریاں حائل ہوں۔کبھی کبھی طویل عرصہ گزر جانے کی وجہ سے یا جغرافیائی فاصلے کے سبب بھی مواد کی فراہمی میں مشکلیں درپیش ہوتی ہیں۔چناں چہ دنیا کی بعض عظیم شخصیتوں مثلاً کالی داس، یا شیکسپیئر وغیرہ کی اچھی اور مستند سوانح عمریاں محض اس وجہ سے وجود میں نہیں آسکیں کہ ان کے متعلق مستند اور تفصیلی معلومات کی دستیابی ممکن نہ ہوسکی۔چناں چہ سوانح نگاری کے لیے ایسے افراد کا انتخاب زیادہ مناسب ہے جن کے متعلق مستند اور سوانح عمری کے لیے مفید مواد دستیاب ہو یا اس موجودہ مواد تک رسائی ممکن ہو۔سوانح نگاری کے لیے ایسے افراد و شخصیات کا انتخاب بھی نامناسب ہے جن سے متعلق مواد اور معلومات دوسروں کی تحویل میں ہو۔اور اس مواد تک رسائی ممکن ہو یا اسے آزادی کے ساتھ بروئے کار لانے کی آزادی حاصل نہ ہو۔

سوانح نگاری کے لیے موضوع کا انتخاب کر لینے کے بعد اس سے متعلق مواد و معلومات تک رسائی اور ان فراہمی کے مختلف ذرائع ہیں۔ان ذرائع کا استعمال کر کے کارآمد مواد جمع کیا جاسکتا ہے۔یہ ذرائع ہیں۔

﴿۱﴾ تصانیف ﴿۲﴾ خودنوشت تحریریں ﴿۳﴾ متفرق دستاویزات ﴿۴﴾ کتابیں
﴿۵﴾ سمعی رکارڈ ﴿۶﴾ سمعی وبصری مواد ﴿۷﴾ معاصرین کی شہادت ﴿۸﴾ ذاتی مشاہدہ
﴿۹﴾ الواح وکتبات، وغیرہ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

﴿۱﴾ **تصانیف:** اگر صاحب سوانح قلم کار رہے تو اس کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کا مطالعہ۔

﴿۲﴾ **خودنوشت تحریریں:** خودنوشت تحریروں کے تحت ذاتی تحریریں آتی ہیں۔مثلاً روزنامچے، یادداشتیں، خطوط اور بیاضوں وغیرہ کا مطالعہ کر کے بے حد کارآمد معلومات حاص کی جاسکتی ہیں۔

﴿۳﴾ **متفرق دستاویزات:** اس کے تحت قانونی دستاویز، مقدمے کے کاغذات، شجرہ مطالعہ، میونسپلٹی کا رجسٹر ولادت و وفات، وصیت نامہ، نکاح نامہ، بیع نامہ اور دیگر کاغذات، اس کے علاوہ تعلیمی اداروں میں داخلہ فارم اور امتحانات کے فارم، تعلیمی رکارڈ وغیرہ نیز زائچہ، ملازمت سے متعلق Service Book (سروس بک)، پاس پورٹ، راشن کارڈ، انکم ٹیکس وغیرہ کے کاغذات اور طبی رکارڈ وغیرہ کے مطالعہ سے مستند اور مفید معلومات حاصل کی جاسکتی ہے۔

﴿۴﴾ **کتابیں:** اس کے تحت تاریخی کتابیں اور تذکرے وغیرہ آتے ہیں۔

﴿۵﴾ **سمعی رکارڈ:** ریڈیو پر مباحثے وغیرہ کے پروگرام کے رکارڈ، ادبی پروگرام کے رکارڈ وغیرہ اگر وہ موجود ہو تو ان تک رسائی حاصل کرنی چاہیے۔

﴿۶﴾ **سمعی وبصری مواد:** فلم، ٹیلی ویژن وغیرہ کے مختلف پروگرام کے رکارڈ وغیرہ اگر وہ موجود ہو تو ان تک رسائی حاصل کر کے ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔

﴿۷﴾ **معاصرین کی شہادت:** اس کے تحت خاندان کے افراد، عزیز واقارب، رفقائے کار اور احباب و معاصرین سے براہ راست گفتگو یا سوال ناموں کے ذریعہ صاحب سوانح سے متعلق مفید معلومات حاصل کی جا سکتی ہے۔اس کے علاوہ اس دور کے اخبارات ورسائل کا وغیرہ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

﴿۸﴾ **ذاتی مشاہدہ:** اگر صاحب سوانح حیات ہے تو اس کے عادات اطوار اور نفسیاتی کیفیت وغیرہ کا مطالعہ ومشاہدہ، اس کا کردار، گفتار، اقوال واعمال کا مطالعہ۔اس کے نظریات وغیرہ کا تجزیہ اس کی شخصیت وسیرت کا تعین کرنے میں ہوتا ہے۔

﴿۹﴾ **الواح وکتبات:** اس کے تحت مزارات وغیرہ کندہ عبارتیں، لوح قبر، مقبروں کے محراب اور دیواروں، دروازوں وغیرہ پر کندہ عبارت ونقوش وغیرہ کا مطالعہ شامل ہے۔

01.08 خلاصہ

اردو کی نثری اصناف کو افسانوی اصناف اور غیر افسانوی اصناف میں تقسیم کیا گیا ہے۔افسانوی اصناف ادب میں ناول، افسانہ اور ڈرامہ جیسی اصناف ہیں جن کی بنیاد قصہ یا کہانی پر ہے۔جب کہ غیر افسانوی اصناف میں خاکہ، انشائیہ، سفرنامہ، رپورتاژ، خطوط اور سوانح عمری جیسی اصناف ادب شامل ہیں۔اردو میں سوانح نگاری کا جدید تصوّر مغربی ادبیات کا نتیجہ ہے۔اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث یہ صنف فروغ حاصل کر کے اردو کی ایک اہم ادبی صنف کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

ماہرینِ فن نے سوانح نگاری کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔مثلاً انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں سوانح عمری کی تعریف یوں درج ہے:

> ''سوانح عمری ایک ایسا بیانیہ ہے جو کسی فرد کی زندگی اور شخصیت کی بازآفرینی اور اس کے عمل کو شعوری اور فن کارانہ انداز میں قلم بند کرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔''

انسائیکلو پیڈیا امریکانا میں سوانح عمری کی تعریف یہ ہے:

> ''سوانح عمری کسی شخص کی حقیقی زندگی کا حساب وکتاب ہے۔''

جب کہ چیمبرس انسائیکلو پیڈیا میں (Chambers Encyclopedia) میں سوانح نگاری کی تعریف قدرے تفصیل سے درج ہے:

> ''سوانح حیات کسی مخصوص فرد کی زندگی اور کردار کے مسلسل بیان کا فن کارانہ اظہار ہوتا ہے۔اس میں یہ اضافہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ سوانح عمری سے زیادہ دل چسپ شعبہ ادب میں کوئی نہیں ہوتا۔نیز یہ کہ نوعِ انسانی کا دلکش ترین مرکزِ مطالعہ ہمیشہ سے انسان رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔''

(Cassell's Encyclopedia ofLiterature) میں سوانح عمری کی تعریف زیادہ وضاحت سے کام لیا گیا ہے:

> ''سوانح عمری تاریخ کی ایک شاخ ہوتی ہے۔اس کا مقصد جہاں تک ہو سکے دیانت داری کے ساتھ کسی فرد کی زندگی کا بیان ہوتا ہے۔سوانح نگار کا فرض یہ ہے کہ وہ مورّخ اور مصوّر دونوں حیثیتوں سے کام کرے۔مصوّر کا فرض کیا ہوتا ہے؟ تصویر سازی کے لیے بیٹھنے والے شخص کی ایسی شبیہ تیار کرنا جو نہ صرف اس

سے ملتی جلتی ہو بلکہ فن کا نمونہ بھی ہو اور مورّخ کا فرض کیا ہے؟ ٹھیک ٹھیک باتیں کرنا اور حقائق کو قابل فہم انداز سے ترتیب دینا۔ حقائق کی محض فہرست مرتب کر دینا جس میں فن کاری نہ ہو، تاریخ ہی ہے نہ کہ سوانح عمری۔‘‘

غرض یہ کہ سوانح عمری سے مراد یہ ہے کہ زمان و مکان کے مخصوص دائرے میں سماج و تہذیب اور مذہبی روایات نیز نسل و ماحول وغیرہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی شخص کی داخلی اور خارجی شخصیت کا ایسا جامع مطالعہ پیش کیا جائے جس سے اس کی زندگی تمام نشیب و فراز کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آ جائے۔

قدیم زمانے میں صرف بادشاہوں، امیروں، سورماؤں یا بزرگانِ دین کی سوانح عمریاں لکھی جاتی تھیں لیکن انیسویں صدی میں تعلیم کے فروغ اور نئے سیاسی جمہوری کے سبب عوام میں ذہنی بیداری پیدا ہوئی۔ اور ان کی دل چسپیوں کا مرکز اب عام آدمی بن گیا۔ چناں چہ اب ایسے افراد چاہے ان کا تعلق سماج کے کسی طبقے سے ہو اگر علوم و فنون کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں سوانح نگاری کے مرکز میں آ گئے۔ سوانح نگاری کے لیے لازمی ہے کہ جس شخص کی سوانح عمری لکھی جائے اس کی حیات کی روداد اور زندگی کی سرگرمیوں کے متعلق پورا مواد اسے فراہم ہو۔ اور وہ غیر جانب داری اور دیانت داری کو ملحوظ رکھتے ہوئے سوانح عمری تحریر کرے۔ اگر چہ سوانح نگار کو کسی شخص سے ایسی عقیدت و محبت ہو کہ اس کی شخصیت کے عیوب بیان کرنا ممکن نہ ہو تو ایسے شخص کا انتخاب سوانح نگاری کے لیے نامناسب ہے۔ چناں چہ ضروری ہے کہ سوانح نگار اور صاحب سوانح میں کسی حد تک نظریاتی اور ذہنی مطابقت و مناسبت ہو۔ کیوں کہ محبت و عقیدت کی طرح نظریاتی اختلاف بھی سوانح نگاری کے لیے غیر مناسب ہے۔

سوانح نگار کو صاحب سوانح کی زندگی اور کارناموں سے متعلق مواد کی فراہمی مختلف ذرائع اور وسائل سے کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں صاحب سوانح کی ڈائری، تصانیف، غیر مطبوعہ تصانیف، یادداشتیں، خطوط، تعلیمی رکارڈ، قانونی کاغذات، ملازمت سے متعلق سروس بک وغیرہ کا دقت نظر سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ خاندان کے افراد، احباب، اعزّا اور دیگر معاصرین سے مصاحب یا سوال ناموں کے ذریعے معلومات حاصل کرنی چاہیے۔ اور برآمد ہوئے نتائج کو شگفتہ اور دل نشیں انداز میں ادبی حُسن کو ملحوظ رکھتے ہوئے تحریر کرنا چاہیے۔

01.09 فرہنگ

ارتقا	: ترقی	کتبات	: کتبہ کی جمع، وہ عبارت جو قبروں یا دروازوں پر کندہ کراتے ہیں
اِفادیت	: فائدہ		
اَکابرین	: اکابر کی جمع، بزرگ	کھتونی	: فہرست
الواح	: لوح کی جمع، تختیاں	گوناگوں	: طرح طرح کا، رنگ برنگ
اِمتزاج	: ملاپ، میل جول	مجروح	: زخمی
اُمرا	: امیر کی جمع، مالدار لوگ	مرتکب	: قصوروار، مجرم
اہل روما	: روم کے باشندے	مرکب	: کئی چیزوں سے مل کر بنا ہوا
بروئے کار	: استعمال	مرہونِ منت	: احسان مند، شکر گزار

بیاض	: وہ کتاب جس میں اشعار لکھتے ہیں	مُستنَد	: شک وشبہ سے بالاتر
بیع نامہ	: کسی چیز کی فروخت کی دستاویز	مَشاغل	: مشغلہ کی جمع، کام
پیچ وخم	: اُلجھاؤ	مصوّر	: تصویر بنانے والا
تحقیق	: جانچ، پرکھ	مطبوعہ	: چھپی ہوئی
تصنیف	: لکھی ہوئی	معاصر	: ہم عصر، ایک زمانے کے
تلخ وشیریں	: کھٹے میٹھے	منطقی ترتیب	: اصولی ترتیب، مناسب ترتیب
حقائق	: سچائی	مواد	: معلومات
حیات	: زندگی	موَرِّخ	: تاریخ لکھنے والا
دستاویز	: سند، وہ کاغذات جن کی قانونی حیثیت ہو	وفات	: موت، روح کا جسم سے نکلنا
دِیانت داری	: ایمان داری	ولادت	: پیدائش، جنم، میلاد
رسائی	: پہنچ	توہمات	: بدعقیدگی
روزنامچہ	: ڈائری	مَنصب	: عہدہ، درجہ
زائچہ	: جنم کنڈلی، جنم پتری	اَثر آفرینی	: تاثیر
سمعی وبصری	: سننے اور دیکھنے والے آلات واشیا	ظہور	: وجود
شبیہ	: تصویر	سرگزشت	: روداد
شناخت	: پہچان	مَساوات	: برابری
ضَخامَت	: موٹائی	ممتاز	: نمایاں
طبّی	: ڈاکٹری	نُدرَت	: انوکھاپن
فراہم	: مہیّا	وابستہ	: متعلق
کارہائے نمایاں	: عظیم کارنامے		

01.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ سوانح نگاری کی تعریف اپنے الفاظ میں کیجیے۔

سوال نمبر۲ سوانح عمری کے لغوی معنی کی وضاحت پیش کیجیے۔

سوال نمبر۳ سوانح نگاری کے لیے کیسی شخصیات کا انتخاب کرنا چاہیے؟

سوال نمبر۴ چیمبرس انسائیکلو پیڈیا میں سوانح عمری کا کیا وصف بتایا گیا ہے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبرا سوانح نگاری کے تین اہم عناصر پر تفصیل سے روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر۲ سوانح نگاری کے اہم مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

سوال نمبر۳ سوانح نگاری کا موضوع اور مواد کی فراہمی ذرائع کون سے ہیں؟ تفصیل سے لکھیے۔

01.11 حوالہ جاتی کتب

ا۔ اُردو ادب کا فنی ارتقا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۲۔ اُردو میں سوانح نگاری از سید شاہ علی

۳۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا (۱۹۱۴ء تا ۱۹۷۵ء) از ڈاکٹر ممتاز فاخرہ

۴۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا از الطاف فاطمہ

اکائی 02 اُردو کے اہم سوانح نگار

ساخت

02.01 : اغراض ومقاصد
02.02 : تمہید
02.03 : سوانح نگاری کا پس منظر (دَورِقدیم)
02.04 : خواجہ الطاف حسین حالؔی کی سوانح نگاری
02.05 : شبلؔی نعمانی کی سوانح نگاری
02.06 : حالؔی اور شبلؔی کے بعد اردو کے اہم سوانح نگار
02.07 : خلاصہ
02.08 : فرہنگ
02.09 : سوالات
02.10 : حوالہ جاتی کتب
02.11 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

02.01 اغراض ومقاصد

پیشِ نظر اکائی کا مقصد طلبا کو اردو کی ایک اہم نثری صنف سوانح نگاری کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے چند اہم سوانح نگار مثلاً خواجہ الطاف حسین حالؔی اور شبلؔی نعمانی وغیرہ کے کارناموں سے واقف کرانا ہے۔اس اکائی میں آپ ان سوانح نگاروں کی زندگی کے مختصر حالات اور سوانح نگاری کے میدان میں ان کے کارناموں سے متعلق مواد کا مطالعہ کریں گے۔

02.02 تمہید

جدید اردو ادب میں سوانح نگاری کو ایک اہم صنف کا درجہ حاصل ہے۔ دراصل انیسوی صدی کے آخر میں علی گڑھ تحریک کے دو اہم ستون مولانا الطاف حسین حالؔی اور مولانا شبلؔی نعمانی نے انگریزی زبان وادب کے زیر اثر جب اردو میں سوانح نگاری کا آغاز کیا تو انھوں نے سوانح نگاری کے مشرقی اور مغربی ادبیات کے اصول ونظریات کو مدنظر رکھا۔حالؔی وشبلؔی نے جہاں ایک طرف مغربی اصولوں سے فیض اُٹھایا تو دوسری طرف انھوں نے فارسی کی سوانح نگاری کی مشرقی روایات سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔سوانح نگاری میں بالعموم زندگی کے کسی خاص شعبہ سے تعلق رکھنے والی مایہ ناز شخصیات کے حالاتِ زندگی اوران کے کارناموں کا تفصیل یا اجمالی بیان ہوتا ہے۔اس کے لے ضروری ہے کہ سوانح نگار جس شخص کی سوانح حیات قلم بند کرنا چاہتا ہے۔

تحقیق کر کے اس کے حیات اور کارناموں سے متعلق تمام ضروری مواد کو جمع کرے اور پھر ان تمام جمع شدہ مواد کے تجزیہ سے حاصل ہونے والے نتائج کو اس طرح ترتیب سے پیش کرے کہ اس شخصیت کی پیدائش سے موت تک، زندگی کے تمام اہم واقعات اور کارنامے ایک متحرک فلم کی مانند نگاہ کے سامنے آجائیں۔

مولانا الطاف حسین حالؔی کی ''حیاتِ جاوید''، شبلی نعمانی کی ''الفاروق''، قاضی عبدالغفار کی ''آثارِ ابوالکلام'' اور غلام رسول مہر کی ''غالب'' اُردو میں سوانح نگاری کے قابل قدر نمونے ہیں۔

02.03 سوانح نگاری کا پس منظر (دَورِ قدیم)

اُردو میں سوانح نگاری کے اولین دھندلے نقوش قدیم دکنی ادبیات میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ دکنی شعرا نے مثنوی کی صنف میں پوشیدہ امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے بکثرت مثنویاں تصنیف کیں۔ ان میں بعض مثنویوں میں سوانح نگاری کے دھندلے نقوش با آسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ ایسی مثنویوں میں تاریخی مثنویوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان میں حسن شوقی کی ''فتح نامۂ نظام شاہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس مثنوی میں حسن شوقی نے تالی کوٹ کی جنگ کے اسباب وعلل، نیز جنگ کے واقعات اور اس کے نتیجہ کا ذکر کیا ہے۔ حسن شوقی نے ایک اور مثنوی ''میز بانی نامہ'' میں بیجاپور کے سلطان محمد عادل شاہ کی شادی ۱۰۴۲ھ کا احوال نظم کیا ہے۔ اس کے علاوہ بیجاپور کے شاعر عبدل کی مثنوی ''ابراہیم نامہ'' ۱۰۲۱ھ میں سوانحی عناصر کی تلاش کی جاسکتی ہے۔

عبدل نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عدل وانصاف، رعایا پروری اور علوم وفنون سے دل چسپی کا ذکر کیا ہے۔ دربار بیجاپور کے ملک الشعراء نصرتی کی ''علی نامہ'' ۱۰۷۶ھ بھی سوانحی کوائف کے اندراج کے سلسلے میں ایک اہم کڑی ہے۔ اس مثنوی میں نصرتی نے علی عادل شاہ ثانی کی معرکہ آرائیوں اور فتوحات کا حال درج کیا ہے۔ نصرتی کی ایک اور مثنوی ''تاریخِ اسکندری'' ۱۰۸۳ھ میں بیجاپور کے فرماں روا سکندر عادل شاہ کے سپہ سالار بہلول خاں کی شجاعت اور معرکہ آرائیوں کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ نصرتی نے اپنی ایک مثنوی ''گلشنِ عشق'' ۱۰۶۸ھ کی ابتداء میں اپنے والد کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے اس کا شمار بھی سوانح نگاری میں کرنا چاہئے۔

دکن کے ایک شاعر شاہ حسین ذوقی نے مغل بادشاہ اورنگ زیب کے عہد میں ''غوث نامہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ'' میں اپنے ممدوح کے کوائف اور ان کی کرامات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ دکن میں پیغمبر اسلام کی حیاتِ طیّبہ کے مختلف پہلوؤں پر بھی مثنویوں کی تصنیف کی گئی۔ جن کے عنوانات ''میلاد نامہ، مولود نامہ، شمائل نامہ، معراج نامہ اور وفات نامہ'' وغیرہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان مثنویوں میں سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کن پہلوؤں کو بیان کی گیا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بہر حال ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دکنی مثنویوں پر کسی بھی طرح سوانح نگاری اطلاق نہیں ہوتا۔ البتہ انھیں سوانح نگاری کے اوّلین نقوش ضرور کہا جاسکتا ہے۔

دکنی مثنویوں کی طرح شعرائے اردو کے تذکروں میں بھی شعرا کے سوانحی کوائف کی جانب دھندلے اشارے ملتے ہیں۔ یہ بات ذہن نشیں رہے کہ تذکرہ نگاروں کا مقصد سوانح نگاری نہیں تھا۔ بلکہ وہ متقدمین شعرا اپنے معاصرین کے بے حد مختصر حالات لکھ کر کلام کا نمونہ اور اس پر اپنی تنقیدی رائے درج کر دیتے تھے۔ دورِ جدید میں تذکروں میں درج شعرا کے بے حد مختصر سوانحی کوائف نے ناقدوں اور محققین کی بہت مدد کی ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں سوانح نگاری کے اوّلین نقوش کے ماخذ شعرائے اردو کے تذکرے ہیں۔

اردو میں سوانح نگاری کی ابتدا سے قبل محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آبِ حیات'' کو خاص مقام حاصل ہے۔انھوں نے ''آبِ حیات'' میں شعرائے اردو کے حالات اس خوبی سے درج کیے ہیں کہ ان کی زندگی اور گردوپیش کے حالات،غرض کہ اس عہد کا شعری منظرنامہ ہماری نگاہوں کے سامنے متحرک ہوجاتا ہے۔اردو میں سوانح نگاری کے ارتقا میں سرسید احمد خاں کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ان کی تصانیف ''آثارالصنادید''،''خطباتِ احمدیہ''اور''سیرتِ فریدیہ'' میں ہمیں سوانحی عناصر ملتے ہیں۔آثارالصنادید کے آخری باب میں سرسید نے مشاہیر دہلی کے حالات قلم بند کیے ہیں۔

خطباتِ احمدیہ میں انھوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے بعض گوشوں کو رقم کیا ہے۔جبکہ سیرتِ فریدیہ میں انہوں نے اپنے نانا خواجہ فریدالدین اور والدہ کے مختصر سوانحی مرقعے قلم بند کیے ہیں۔لیکن سرسید کی متذکرہ بالا تصانیف کو بھی ہم اُردو میں سوانح نگاری کا نمونہ نہیں قرار دے سکتے۔حقیقت یہ ہے کہ اردو میں باضابطہ سوانح نگاری کا آغاز مولانا الطاف حسین حالؔی نے کیا۔

02.04 خواجہ الطاف حسین حالؔی کی سوانح نگاری

خواجہ الطاف حسین حالؔی کے مختصر حالاتِ زندگی: شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالؔی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ الطاف حسین حالؔی انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے اسلاف میں ایک بزرگ خواجہ ملک علی بھی تھے جو اپنے وقت کے مشہور ومعروف عالم تھے۔خواجہ ملک علی سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں ہرات سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان آئے تھے۔سلطان غیاث الدین بلبن نے ان کی گزربسر کے لیے پانی پت کے اطراف میں کچھ گاؤں مقرّر کردیے تھے۔ان کی بزرگی اور علم وفضل کے اعتراف میں انھیں پانی پت کا قاضی مقرر کیا گیا اور نمازِ عیدین کی امامت بھی ان کے سپرد ہوئی۔اس کے علاوہ سلطان غیاث الدین بلبن نے اجناس بازاری کا نرخ مقرّر کرنے کی خدمت بھی ان کے سپرد کی۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی کے والد کا نام خواجہ ایزدبخش تھا۔خواجہ ایزدبخش غربت وناداری میں زندگی بسر کرتے تھے۔جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو حالی کی عمر محض نو برس کی تھی۔لہٰذا حالی کی تعلیم وتربیت کا باران کے بڑے بھائی اور بہن پر پڑا۔خواجہ الطاف حسین حالؔی نے قران حفظ کرنے کے بعد رواجِ زمانہ کے مطابق عربی وفارسی کی تعلیم کی ابتدا کی۔ابھی وہ تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کردی گئی۔اس وقت حالی کی عمر سترہ برس بھی نہیں تھی۔تحصیلِ علم کے شوق میں حالؔی نے ایک دن چپکے سے ۱۸۵۴ء میں گھر چھوڑ دیا اور دہلی آگئے۔جو اس وقت ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایشیا میں علم وادب کا اہم مرکز تھا۔دہلی میں حالی کچھ عرصہ تک عربی کی تعلیم حاصل کرتے رہے مگر ۱۸۵۵ء میں گھر والوں کے اصرار پر پانی پت واپس لوٹ گئے لیکن مطالعہ کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔کچھ عرصہ کے بعد ان کی ملاقات جہانگیرآباد ضلع بلندشہر کے رئیس اور اردو کے معروف شاعر نواب مصطفٰے خاں شیفؔتہ سے ہوئی۔صحبتِ شیفؔتہ میں حالؔی کی صلاحیتوں کو نکھرنے کا موقع ملا۔شیفؔتہ ایک معروف شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ جیّد عالم بھی تھے۔شیفؔتہ اردو وفارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔فارسی میں ان کا تخلص حسرؔتی جب کہ اردو میں شیفؔتہ تھا۔حالی نے خود اعتراف کیا ہے کہ انھیں شیفؔتہ کی صحبت سے بہت فائدہ حاصل ہوا۔ اس سلسلے میں حالی کا یہ شعر برمحل ہے:

حالؔی سخن میں شیفؔتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزؔا کا تو مقلِّد ہوں میرؔ کا

شیفتہ کی صحبتوں میں حاؔلی کی شاعری کا سویا ہوا ذوق پھر جاگ اٹھا۔اس درمیان انھوں نے مرزا غاؔلب کو اپنی غزلیں بنظرِ اصلاح دلّی بھیجنی شروع کی۔کچھ عرصے بعد حاؔلی کو لاہور کے گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت مل گئی۔یہاں ان کا کام انگریزی سے اردو ترجمہ کی ہوئی کتب کی عبارت درست کرنا تھا۔یہاں رہ کر حاؔلی کو انگریزی خیالات اور ادبی نظریات سے واقفیت حاصل ہوئی۔چناں چہ ان کے دل میں اپنی زبان اور شاعری کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔لاہور بکڈپو میں تقریباً چار برس کی ملازمت کے بعد حاؔلی دلّی واپس آ گئے جہاں اینگلو عربک اسکول میں بحیثیتِ مدرّس ملازم ہو گئے۔دلّی میں حاؔلی کی ملاقات سرسید احمد خاں سے ہوئی جو حاؔلی کی زندگی کا ایک انقلابی موڑ ثابت ہوئی۔سرسید کی فرمائش پر حاؔلی نے اپنا مشہور زمانہ ''مسدّسِ حاؔلی'' لکھا۔حالی کچھ عرصے تک حیدرآباد میں بھی مقیم رہے۔بعد میں حاؔلی نے ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور پانی پت میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔جہاں ان کا تصنیف وتالیف کا مشغلہ جاری رہا۔

۱۹۰۴ء میں انگریزی حکومت نے ان کی قابلیت اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ''شمس العلما'' کا خطاب سے نوازا۔۱۳ر صفر ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء کو خواجہ الطاف حسین حاؔلی کا انتقال ہو گیا۔شاعر کی حیثیت سے حاؔلی کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں انھوں نے محمد حسین آزاد کے دوش بدوش اردو میں جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔

''اگر چہ جدید شاعری کی بنیاد آزاد کے ہاتھوں پڑی لیکن حالی کی جنبشِ قلم نے اس کو مستقل اور نمایاں شکل دے دی۔''

مختصر تاریخ ادب اردو ص.۱۳۷.ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترمیم اضافہ ڈاکٹر سید محمد عقیل

خواجہ الطاف حسین حاؔلی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''مولانا حالی پرانے زمانے کے یادگار لوگوں میں تھے۔نہایت خلیق، ملنسار، حلیم الطبع اور سچے فدائیِ قوم تھے۔دنیوی جاہ وثروت کا خیال ان کے دل میں مطلق نہ تھا ان کی زندگی ایک سچے انشا پرداز کی زندگی تھی۔جس نے اپنے تعلیمی و تصنیفی مشاغل کے آگے دنیوی مرتبہ وعزت کو ہمیشہ ہیچ سمجھا۔قومی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ فرقہ وارانہ اختلاف سے وہ بالکل علیحدہ تھے۔''

(تاریخِ ادب اردو ص ۲۴۸.رام بابو سکسینہ..مترجم مرزا محمد عسکری

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۲﴾ خواجہ الطاف حسین حاؔلی کو کس سنہ میں ''شمس العلما'' کا خطاب ملا؟

خواجہ الطاف حسین حاؔلی بحیثیتِ سوانح نگار: خواجہ الطاف حسین حاؔلی کی سوانح نگاری کا ذکر کرتے ہوئے مختصر تاریخ ادب اُردو میں ڈاکٹر سید محمد عقیل لکھتے ہیں:

''غالباً حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں سوانح عمری لکھنا رائج کیا۔چناں چہ ''حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید'' سوانح نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔اگر یادگارِ غالب بھی اس سلسلے میں لے لی جائے تو یہ کہنے میں ذرا بھی تکلّف بھی نہیں ہوسکتا کہ تفصیلی حالات کے ساتھ مرنے والے کے کلام پر بھی حاؔلی نے ناقدانہ روشنی ڈالی ہے۔''

﴿۱﴾ **حیاتِ سعدی:** خواجہ الطاف حسین حالؔی کی تینوں سوانح عمریوں میں ''حیاتِ سعدی'' فارسی کے عظیم شاعر و ادیب شیخ سعدی شیرازی کے حیات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔ شیخ سعدی کے مستند اور مفصّل حالات تذکروں میں محفوظ نہیں ہیں۔ فارسی شعرا کے تذکروں میں اگر شیخ سعدی کے متعلق کوئی معلومات مل سکتی ہے تو وہ رطب و یابس سے بھری ہوئی ہیں۔ حیاتِ سعدی میں حالؔی نے یہ طریقۂ کار اختیار کیا کہ تذکروں کی نامکمّل معلومات اور کلامِ سعدی کی داخلی شہادتوں کی مدد سے شیخ سعدی کے حالات اور ان کی سیرت و کردار کا ایک خاکہ مرتب کیا۔ شیخ سعدی سے متعلق روایات کا انھوں نے تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا اور غیر مستند روایات کو بلا جھجھک رد کر کے معقول روایات کو انھوں نے قبول کیا۔ حیاتِ سعدی ۱۸۸۴ء کی تصنیف ہے۔

حالؔی نے حیاتِ سعدی میں شیخ سعدی کے معاصر شعراء کا بھی تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ سوانح نگاری کے جدید اصولوں کو بروئے کار لا کر شیخ سعدی کے مزاج، اخلاق، عادت، سیرت و شخصیت اور کردار پر معاصر سماجی و سیاسی حالات کا جائزہ لیا ہے۔ حالؔی اردو کے پہلے جدید سوانح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ پہلے شخص ہیں جنھوں نے انسان کی شخصیت اور کردار کی تشکیل و تعمیر میں سماجی، سیاسی حالات اور طبعی ماحول کی کارفرمائی کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اردو میں حیاتِ سعدی اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں سوانح عمری کے جدید اصولوں کی روشنی میں کسی شخص کے حالاتِ زندگی اور اس کے فن کے کمالات کا محقّقانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔

چناں چہ اس کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے شبلی نعمانی نے لکھا کہ حیاتِ سعدی:

''شیخ سعدی کی نہایت دل چسپ اور محققانہ سوانح عمری ہے۔''

(بحوالہ: افادتِ مہدی، ص ۱۴، مہدی افادی)

حیاتِ سعدی کا ذکر کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ:

''اس سے مولانا نے اردو نثّاروں کی صفِ اوّل میں جگہ پائی اور ان کی سوانح نگاری کی قابلیت اور اسلوبِ بیان کا پتہ چلا۔''

(تاریخ ادب اردو، ص ۳۱۵، رام بابو سکسینہ، مترجم: مرزا محمد عسکری)

﴿۲﴾ **یادگارِ غالب:** حالی کی تصنیف کردہ سوانح عمریوں میں سب سے زیادہ مقبول ''یادگارِ غالب'' ہے۔ یادگارِ غالب میں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی زندگی کے حالات اور واقعات بے حد دل چسپ انداز میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا غالب کے لطائف و ظرائف بیان کرنے کے ساتھ ان کے کلام پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ یادگارِ غالب ۱۸۹۶ء یا ۱۸۹۷ء کی تصنیف ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی غالبؔ کے شاگرد تھے انھیں اپنے استاد سے بے پناہ دلی عقیدت و محبت بھی تھی۔ انھیں غالب کی صحبت سے فیضیاب ہونے کے مواقع ملے۔ لہٰذا یادگارِ غالب میں درج اکثر واقعات کے چشم دید گواہ خود حالی ہیں۔ لیکن حالؔی نے صرف چشم دید واقعات اور ذاتی معلومات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جدید سوانح نگاری کے سائنٹفک اصولوں سے کام لیا۔

چناں چہ حالی یادگارغالب کا دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''کبھی کبھی مجھ کواس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے تمام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوسکیں اوران کی شاعری وانشاپردازی کے متعلق جو امور کہ احاطۂ بیان میں آسکیں اورابنائے زمانہ کی فہم سے بالاتر نہ ہوں ان کو اپنے سلیقے کے موافق قلم بند کروں۔''

(دیباچہ: یادگارِغالب)

یادگارِغالب کے دیباچہ میں حالؔی نے اپنے طریقۂ کار کی بھی وضاحت کی ہے:

''میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لے کر جمع کیا۔اور جس قدر اس میں ان کے حالات اوراخلاق وعادات کا سراغ ملاان کو قلم بند کیااور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یادوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں ان کو ضبطِ تحریر میں لایا۔''

(دیباچہ: یادگارِغالب)

ایک اچھے سوانح نگار کی حیثیت سے الطاف حسین حالؔی نے غالب کے مختلف بیانات اورخطوط کے ذخیروں سے بھی اِستفادہ کیا۔ حالؔی کو اگرچہ مرزاغالب کی صحبت میں رہنے اوران کی شخصیت اور کردار کو جانچنے کا موقع ملا تھا۔لیکن مرزاغالب کے حالاتِ زندگی جمع کرنے میں انہوں نے حددرجہ احتیاط سے کام لیا۔رام بابوسکسینہ یادگارِغالب کا تنقیدی محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس تصنیف کے ذریعے سے حالؔی نے اپنے استاد غالب کی شاگردی کا حق اس طرح ادا کر دیا جس کہ آزاد نے دیوانِ ذوق کو ترتیب دے کر ذوق کو زندہ جاوید بنادیا.....''یاگارغالب''تنقیدی کتابوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔''

(تاریخ ادب اردو،ص ۳۱۵،رام بابوسکسینہ،مترجم:مرزامحمد عسکری)

یہ حقیقت ہے کہ یاگارِغالب،غالب پرایک مستنداور جامع کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

﴿۳﴾ **حیات جاوید:** ''حیاتِ جاوید''الطاف حسین حالؔی کی تیسری سوانحی تصنیف ہے۔حیاتِ جاوید دراصل سرسیداحمد خاں کی ایک جامع ومفصّل سوانح عمری ہے۔حالؔی سرسید کے مشن میں ان کے رفیق تھے۔انھیں سرسیداور ان کے مشن سے والہانہ لگاؤ تھا۔اس محبت اورشیفتگی کے باعث حالؔی کے لیے سرسید کی سوانح عمری لکھنے کی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل اورصبرآزما مرحلہ تھا۔لیکن اگرچہ چندنقائص سے قطع کرلیا جائے تو حالی اس بڑی ذمہ داری اورفرض سے انتہائی خوبی اورکامیابی سے سبک دوش ہوئے ہیں۔

حیاتِ جاوید کا ذکر کرتے ہوئے رام بابوسکسینہ لکھتے ہیں:

''حالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ کتاب ہے جس کی وجہ سے خودانھوں نے حیاتِ ابدی پائی۔یہ ایک بہت مفصّل اور جامع وضخیم کتاب ہے۔اس میں سرسیدمرحوم کی طویل اورمختلف الاحوال اورکثیرالاشغال زندگی

کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ درج ہیں کہ اس کو زبان اردو میں وہی مرتبہ حاصل ہوگیا ہے جو باسویل کی مشہور کتاب ''ڈاکٹر جانسن کی لائف'' کو انگریزی میں حاصل ہوا ہے .....یہ ایک مہتم بالشان تصنیف ہے۔ لیکن اس میں ہیرو کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہے۔اسی وجہ سے مولانا شبلی کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب میں تصویر کا صرف ایک رُخ دکھایا گیا ہے۔معائب سے یا تو چشم پوشی کی گئی ہے یا ان کی کوئی توجیہ کردی گئی ہے۔''

(تاریخ ادب اردو،ص ۳۱۶،رام بابو سکسینہ،مترجم:مرزا محمد عسکری)

حیاتِ جاوید میں حاؔلی نے سرسید کی عوامی اور نجی زندگی کے تقریباً تمام اہم اور قابلِ ذکر واقعات کو بیان کردیا ہے۔سوانح نگاری کے جدید اصولوں کو بروئے کار لاکر حالی نے سرسید کی شخصیت اور کردار کی تشکیل وتعمیر میں اہم کردار ادا کرنے والے عوامل جیسے خاندان، ماحول، معاشرت وغیرہ کے علاوہ دیگر اثرات کا بھی تجزیہ کیا ہے۔لیکن سرسید سے قلبی محبت اور ان کے مشن سے والہانہ شیفتگی کے باعث حاؔلی نے سرسید کی تعریف میں حد سے تجاوز بھی کیا ہے۔اگر وہ سرسید کی سیرت اور شخصیت کے کسی کمزور پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو اس کے بیان کے ساتھ تاویلات بھی پیش کرتے جاتے ہیں۔حالی کا یہ طریقہ کار دراصل سوانح نگاری کے اصولوں کے خلاف ہے۔

اس سلسلے میں رام بابو سکسینہ حاؔلی کے موقف کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہماری رائے میں اس زمانے کی تصانیف کو اتنی سختی کے ساتھ جانچنا مناسب نہیں ہے۔اس وجہ سے کہ سوانح نگاری اور فنِ تنقید ہمارے یہاں ابتدائی حالت میں ہیں۔''

(تاریخ ادب اردو،ص ۳۱۶،رام بابو سکسینہ،مترجم:مرزا محمد عسکری)

حیاتِ جاوید کا سب سے اچھا پہلو اس کی جامعیت ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حیاتِ جاوید صرف سرسید احمد خاں کی سوانح عمری نہیں بلکہ اسے اس پورے عہد کے ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی وتمدنی تاریخ کہنا زیادہ مناسب ہے۔

اُردو ادب کی تاریخ میں حاؔلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے سوانح نگاری کو ایک فن کے طور پر اپنایا۔انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اُردو میں سوانح نگاری کے لیے راستہ ہموار کیا۔اور اس فن کے اصول ومعیار بھی مقرّر کیے۔حالی طبعاً معتدل مزاج، بردبار اور سنجیدگی کے حامل شخصیت تھے۔ان کی تحریر میں جو گداز اور دردمندی ہے اور ان کے انداز میں جو توازن ہے، جو سلامت روی ہے۔اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سوانح نگاری کے لیے ایک موزوں انسان تھے۔

حاؔلی انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد کے شکست خوردہ ہندوستان میں سوانح نگاری کے ذریعہ اپنے ہیرو کی شخصیت اور سیرت کے مثبت پہلوؤں کو اُبھار کر قوم کے نوجوانوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔حاؔلی کے خیال میں سوانح عمری سے بھی قوم کی ترقّی کے لیے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں۔حالی ادب کی افادیت کے قائل تھے۔چناں چہ سوانح عمری ان کے نزدیک ایک افادی صنف ادب ہے۔

حالی کا طرزِ بیان بہت صاف اور درد واثر میں ڈوبا ہوتا ہے۔حالی ادب کے افادی پہلو پر توجہ دیتے ہیں لہٰذا وہ طرزِ اسلوب سے زیادہ نفسِ مضمون کی ادائیگی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی عبارت بہت سلجھی ہوئی اور صاف ستھری ہوتی ہے۔جدید اردو نثر کو ابتدائی دور میں حاؔلی جیسا فنکار ملا جس نے سادہ اور آسان نثر کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسے اس قابل بنانے میں مدد کی کہ اس میں ہر قسم کے مضامین ادا ہوسکیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۳﴾ حیاتِ سعدی کی سنہ تصنیف بتائیے؟

﴿۴﴾ حیاتِ سعدی کس کی سوانح حیات ہے؟

﴿۵﴾ حیاتِ جاوید کا مصنف کون ہے؟

02.05 شبلی نعمانی کی سوانح نگاری

شبلی نعمانی کے مختصر حالاتِ زندگی: شبلی نعمانی اپنے زمانے کے مشہور اور قابل ترین شخصیتوں میں سے ایک تھے۔شبلی کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''اگر کوئی ایک شخص،ایک شاعر،فلسفی،مؤرخ،ناقد،ماہرِ تعلیم،معلّم،واعظ،ریفارمر،جریدہ نگار،فقیہ،محدّث،سب کچھ ہوسکتا ہے تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی کہ انھوں نے ان سب کمالاتِ مختلفہ اور علوم وفنون متنوعہ کا اپنی ذات میں اجتماع کرلیا تھا۔''

(تاریخِ ادب اردو،ص ۳۲۳،رام بابو سکسینہ،مترجم:مرزا محمد عسکری)

شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا جو پیشے سے وکیل تھے۔شبلی نے ابتدائی تعلیم مولوی شکراللہ سے حاصل کی۔بعد میں اپنے وقت کے مشہور عالم مولوی فاروق چریا کوٹی سے انھوں نے عربی ادب اور معقولات کی تعلیم حاصل کی۔تحصیلِ علم کے لیے شبلی نے رام پور،لاہور،سہارن پور اور لکھنؤ کا سفر بھی کیا اور اس وقت کے قابل اساتذہ سے معقولات و منقولات اور فقہ وحدیث کا علم حاصل کیا۔۱۸۷۶ء میں جب وہ صرف ۱۹/برس کے تھے حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے بیت اللہ کا سفر کیا۔شبلی کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔چناں چہ کتب فروشوں کی دکان پر بیٹھ کر اکثر کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

آگے چل کر شبلی نے اپنے والد کے اصرار پر وکالت کا امتحان پاس کیا۔انھوں نے کچھ دنوں تک وکالت بھی کی لیکن انھیں یہ پیشہ پسند نہ آیا۔وکالت کو خیرآباد کہہ کر شبلی سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے مگر وہاں بھی ان کا دل نہ لگا۔چناں چہ ملازمت سے مستعفی ہوکر علمی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔۱۸۸۲ء میں علی گڑھ میں زیرِ تعلیم اپنے بھائی مہدی سے ملنے علی گڑھ چلے گئے۔اتفاقاً ان کی ملاقات سرسید سے ہوگئی۔سرسید نے شبلی کی لیاقت کو پہچان لیا اور علی گڑھ کالج میں فارسی کا پروفیسر مقرر کردیا۔علی گڑھ کی علمی فضا شبلی کو بہت پسند آئی۔انھیں سرسید کے ذاتی کتب خانہ سے استفادے کا موقع ملا اور دیگر اہلِ علم حضرات کی صحبت سے ان کی طبیعت کو جلا حاصل ہوئی۔شبلی کے دل میں ملّت کا درد موجزن تھا۔چناں چہ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ:

''شبلی نے اسلام کی گزشتہ شان وشوکت کو دنیا کے سامنے نئی آب وتاب کے ساتھ پیش کرکے مسلمانوں میں جوش پیدا کرنے کی کوشش کی۔مسلمانوں کی نادر ہستیوں کو پیش کرکے اپنی بے حس قوم کو بیدار کرنا چاہا اور اس سلسلے میں ''المامون،الفاروق،سیرۃ النعمان،الغزالی وغیرہ مختلف اوقات میں لکھیں۔ان میں بعض کتابوں کے مواد اکٹھا کرنے کے لیے ان کو شام ومصر اور قسطنطنیہ وغیرہ کا سفر کرنا پڑا۔''

(مختصر تاریخِ ادب اردو،ص:۲۸-۲۹،ڈاکٹر سید اعجاز حسین)

شبلی سرسید کے انتقال کے بعد بعض وجوہ کی بنیاد پر علی گڑھ سے ترکِ تعلق کر کے گھر واپس آ گئے۔ بعد میں حیدر آباد گئے اور وہاں کے مختصر قیام میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔

حیاتِ شبلی میں ندوۃ العلما اور دارالمصنفین اعظم گڑھ، دو اہم سنگ میل ہیں۔ ندوۃ العلما کا قیام ۱۸۹۴ء میں عمل میں آیا۔ اس کا مقصد مدارس کی تعلیم کا نصاب میں اصلاح تھا۔ شبلی ابتدا ہی سے ندوہ سے وابستہ رہے لیکن بعض اختلافات کے سبب ۱۹۱۳ء میں انھوں نے لکھنؤ کو بھی خیر باد کہا اور اعظم گڑھ آ کر ''دارالمصنّفین'' کی بنیاد ڈالی۔ جس کا بنیادی مقصد تھا علمی مشاغل کے لئے لائق اور عمدہ مصنفوں کی جماعت تیار کرنا۔ دارالمصنفین کے لئے انھوں نے اپنی جائیداد وقف کر دی۔

شبلی کی خدمات کے اعتراف میں انگریزی حکومت نے انھیں ''شمس العلما'' کا خطاب عطا کیا۔ اس کے علاوہ ۱۸۹۲ء میں ترکی کے سلطان نے انھیں ''تمغۂ مجیدی'' عطا کیا۔ شبلی کی آخری تصنیف ''سیرت النبیؐ'' ہے۔ اس کی تکمیل شبلی کا خواب تھا جسے وہ اپنی موت کے باعث مکمل نہ کر سکے۔ شبلی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۶﴾ شبلی کی سنہ پیدائش بتائیے۔

شبلی نعمانی بحیثیتِ سوانح نگار:

﴿۱﴾ **المامون:** الطاف حسین حالی کے بعد شبلی اردو کے دوسرے اہم سوانح نگار ہیں۔ شبلی عظمتِ اسلام کے جذبہ سے سرشار تھے۔ انھیں مسلمانوں کے شان دار ماضی پر فخر تھا۔ وہ یہی جذبۂ قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اپنے اس جذبے کو عملی شکل دینے کے لیے شبلی نے نام ورانِ اسلام ''ہیروز آف اسلام'' کی تصنیف کا آغاز کیا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی ''المامون'' ہے۔ اس میں انھوں نے عباسی خلیفہ مامون کے حالاتِ زندگی رقم کیے۔ المامون ۱۸۸۹ء کی تصنیف ہے۔ شبلی نے المامون کے دیباچہ میں لکھا کہ ان کے دل میں اسلام کی مفصّل تاریخ لکھنے کا ارادہ تھا لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے۔ چناں چہ انھوں نے تاریخ اسلام کی چند نام ور شخصیات کے حالات اور کارناموں کی صحت و جامعیت کے ساتھ پیش کرنے پر اکتفا کیا۔ انھوں نے بہت محنت سے خلیفہ مامون کے مستند حالات اور شواہد کو جمع کیے۔ المامون میں اس عہد کے حالات اور دارالخلافہ بغداد کی تہذیب و تمدّن کی عمدہ تصویریں نظر آتی ہیں۔

﴿۲﴾ **سیرۃ النعمان:** شبلی نعمانی کی دوسری سوانح عمری ''سیرۃ النعمان'' ہے۔ جس کا سنہ تصنیف ۱۸۹۱ء ہے۔ اس میں شبلی نے فقہِ حنفی کے بانی امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات اور ان کی علمی خدمات کا بیان کیا ہے۔ سیرۃ النعمان کی تصنیف کا سبب یہ تھا کہ اردو میں امامِ اعظم کی کوئی مستند سوانح عمری موجود نہیں تھی اور شبلی اس کمی کو پورا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ شبلی کو امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہت عقیدت تھی۔ سیرۃ النعمان میں شبلی کا مؤرخ ذہن کام کرتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے بیان کے لیے صرف انھیں واقعات کا انتخاب کیا ہے جو روایت اور عقل کی کسوٹی پر کھرے اُترتے تھے۔

﴿۳﴾ **الفاروق:** شبلی نعمانی کی تیسری سوانح عمری ''الفاروق'' ہے۔شبلی کی سوانح عمریوں میں الفاروق کو ممتاز مقام حاصل ہے۔اس کی تکمیل کے لیے انھوں نے مواد کی تلاش میں روم وشام کا بھی سفر کیا۔الفاروق حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح عمری ہے۔الفاروق میں شبلی کا فکری اور فنّی شعور پختگی کی صورت میں نمایاں ہے۔الفاروق میں شبلی ایک بہترین مؤرخ اور اچھے سوانح نگار کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔انھوں نے الفاروق میں الفاروق حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لیاقت،تدبّر،مذاقِ شعر،سیاسی حکمتِ عملی اور علمی رجحانات وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے انھوں نے بشری کمزوریوں سے بھی چشم پوشی نہیں کی اور نہ ہی تاویلات کا سہارا لیا۔

﴿۴﴾ **الغزالی:** امامِ غزالی کی سوانح عمری جو ''الغزالی'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

﴿۵﴾ **مولانا روم:** فارسی کے بلند پایہ شاعر مولانا روم کی سوانح عمری جو ''سوانحِ مولانا روم'' کے عنوان کے تحت شائع ہوئی۔

ان دونوں سوانح عمریوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں صاحبِ سوانح کے حالاتِ زندگی کو کم جگہ ملی ہے جب کہ ان کے کمالات کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے ۱۹۰۲ء میں شبلی نے دو مشاہیر کی سوانح عمریاں قلم بند کیں۔

﴿۶﴾ **سیرۃ النبی:** شبلی کی آخری اور معرکتہ الآرا سوانحی تصنیف ''سیرۃ النبی'' ہے۔سیرۃ النبی شبلی نعمانی کا خواب تھا لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اسے مکمل نہ کر سکے۔ان کے بعد سید سلیمان ندوی نے اس کام کو تکمیل تک پہنچایا۔شبلی نے دل میں مدتوں سے پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سوانحِ اقدس قلم بند کرنے کا خیال تھا۔اس زمانے میں انگریز مؤرخین نے پیغمبر اسلام کی جو سوانح عمریاں تصنیف کیں ان میں غلط بیانی سے کام لیا گیا۔ہندوستان کی نئی تعلیم یافتہ نسل جو کہ انگریزی زبان وادب سے مرعوب تھی،اس کے قلب وجگر پر ان غلط بیانیوں کا خراب اثر مرتب ہو رہا تھا۔ان زہریلے اثرات کو زائل کرنے کے لیے شبلی نعمانی نے سیرۃ النّبی کی تصنیف کو اپنا مقصد بنالیا۔ان کے خیال میں اس تصنیف کی عالم گیر ضرورت اور اہمیت کی حامل تھی۔جس میں ہر قسم کے مسائل،حقائق کے اہتمام کے ساتھ زیر بحث آئیں۔جو عیسائی مؤرخین وغیرہ کے بے سروپا اعتراضات کا دنداں شکن جواب بن جائیں۔اس عظیم الشّان تصنیف کے لیے شبلی میں صلاحیتیں موجود تھیں لیکن وہ سیرۃ النبی کی دو جلدیں ہی مکمل کر سکے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔باقی چار جلدیں سید سلیمان ندوی نے مکمّل کیں۔

سیرۃ النبی کی سب سے بڑی خصوصیت شبلی کے الفاظ میں یہ ہے کہ سیرۃ النبی ''دائرۃ المعارف النبویہ'' یعنی سیرت نبوی کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔شبلی نعمانی نے حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سوانح نگاری کو جدید اصولوں کے مطابق پیش کیا۔غرض کہ سیرۃ النبی شبلی نعمانی کا آخری مگر زندہ جاوید کارنامہ ہے۔اس کے علاوہ ''حیاتِ حافظ،حیاتِ خسروؔ'' وغیرہ کا شمار بھی شبلی نعمانی کی تصنیف کردہ سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔

شبلی نعمانی کا اندازِ بیان سادہ وسلیس اور صاف ستھرا ہے۔موقع ومحل کی مناسبت سے وہ موضوع کی خشکی کو دل چسپ بنانے کے لیے تشبیہات واستعارات سے بھی کام لیتے ہیں۔ان کا اندازِ بیان ایسا دل نشیں ہے کہ بلند سے بلند مضامین بھی وہ سادہ اور سلیس زبان میں ادا کرنے پر قادر ہیں۔شبلی کی تحریر میں تقریر کی سی لذّت ہے۔ان کا اندازِ بیان بالعموم ہموار رہتا ہے۔

رام بابو سکسینہ کے مطابق:

''مولانا ہمیشہ صفائی اور سادگی اور وضاحتِ کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ان کی عبارت کبھی گنجلک نہیں ہوتی۔مولانا کے یہاں صنائع و بدائع اور عبارت میں تکلف بہت کم ہوتا ہے اور گو کہ اکثر جگہ فصاحت اور زورِ بیان مضمون میں چار چاند لگا دیتا ہے پھر بھی نفسِ مطلب واضح رہتا ہے۔''

(تاریخِ ادب اردو، ص ۳۲۸، رام بابو سکسینہ)

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ المامون کا سنہ تصنیف بتایئے؟

﴿۸﴾ سیرۃ النعمان کا سنہ تصنیف بتایئے؟

﴿۹﴾ سیرۃ النعمان کس کی سوانح حیات ہے؟

02.06 حالؔی اور شبلؔی کے بعد اردو کے اہم سوانح نگار

حالؔی اور شبلؔی اردو کے اہم اوّلین سوانح نگار ہیں۔ان کی تصنیف کردہ سوانح عمریوں کو عوام و خواص میں مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی تو دوسرے اہلِ قلم بھی اس جانب متوجہ ہوئے۔اس زمانے کے دیگر اہم سوانح نگاروں میں مرزا حیرت دہلوی، عبدالرزاق کانپوری، احمد حسین الہ آبادی، مولوی ذکاء اللہ اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری وغیرہ اہم سوانح نگار ہیں۔

مرزا حیرت دہلوی صحافت سے وابستہ تھے۔انھوں نے کئی سوانح عمریاں تصنیف کیں۔جن میں سیرت محمدیہ ۱۸۹۰ء، نورتن اکبری مع سوانح اکبر، نور جہاں بیگم، زیب النساء بیگم، فردوسی، ارسطو، افلاطون، حیات حمیدیہ اور حیاتِ طیبہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔مرزا حیرت دہلوی کی سوانح عمریوں میں سیرتِ محمدیہ پیغمبر اسلام کی سوانح اقدس ہے۔اور اس دور کے مخصوص ماحول کے مطابق مناظراتی انداز میں لکھی گئی ہے۔اس کے علاوہ حیات طیبہ شاہ اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری ہے۔مرزا حیرت دہلوی کو سوانح نگاری کے فن پر دسترس حاصل ہے۔عبدالرزاق کان پوری کی ''البرامکہ'' کو اردو سوانح عمریوں کے درمیان قابلِ ذکر مقام حاصل ہے۔عبدالرزاق کانپوری سوانح نگاری میں حالؔی و شبلؔی سے خاصے متاثر تھے۔

احمد حسین الہ آبادی نے چار سوانح عمریاں تصنیف کیں۔''حیاتِ سعدی''، ''حیاتِ نورالدین محمود''، حیاتِ ذوق اور حیاتِ سلطان صلاح الدین'' اسی دَور میں منشی محمد الدین فوق نے بھی کئی سوانح عمریاں تصنیف کی ہیں۔جن میں ابوالحسن ملّا دو پیازہ، مہاراجہ رنجیت سنگھ، غنی کاشمیری، یادِ رفتگاں کے علاوہ نور جہاں اور جہانگیر سوانح عمریاں شامل ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد نے ''امہات الامّۃ'' کے عنوان سے ازواجِ مطہرات کی سوانح عمریاں تصنیف کیں۔لیکن یہ کتاب شدید تنقید کا نشانہ بنی۔اس پر اعتراض کیا گیا کہ اس کی زبان ان محترم و مقدس ہستیوں کے شایانِ شان نہیں تھی۔یہ حقیقت ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے جو کامیابی ناول نگاری میں حاصل کی وہ سوانح نگاری میں حاصل نہ کر سکے۔ رفقائے سرسید میں مولوی ذکاء اللہ نے ملکہ وکٹوریہ اور پرنس البرٹ کی سوانح حیات تصنیف کی۔قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے ۱۹۱۷ء میں تین حصّوں میں ''رحمۃ اللعلمین'' کے عنوان سے پیغمبر اسلام کی سوانح عمری تصنیف کی۔اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے ان کی اس کتاب کو سیرتِ

طیبہ سے متعلق دوسری کتابوں کے درمیان ممتاز مقام حاصل ہے۔اسی دَور میں افضل حسین ثابت نے ۱۹۱۳ء میں ''حیاتِ دبیر'' کے عنوان سے مرزا سلامت علی دبیر کی ضخیم سوانح عمری تصنیف کی۔

اس طرح رفتہ رفتہ اردو میں سوانح عمریوں کے ذخیرہ میں اضافہ ہوتا رہا۔اور نئے نئے سوانح نگار اس قافلے میں شامل ہوتے رہے۔ شبلی کے لائق شاگرد اور معروف اہلِ قلم سید سلیمان ندوی نے کئی سوانح عمریاں تصنیف کیں۔ان میں رحمتِ عالم، حیاتِ امام مالک، سیرتِ عائشہ، حیاتِ شبلی اور سیرۃ النبی (آخری چار جلدیں)۔سید سلیمان ندوی نے پہلی مرتبہ بچوں کے لیے پیغمبر اسلام کی سیرتِ طیبہ رحمتِ عالم کے عنوان سے تصنیف کی۔اس طرح مولانا عبدالسلام ندوی نے فقرائے اسلام سیرت عمر بن عبدالعزیز لکھ کر سوانح عمری کے فن میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔اس کے علاوہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولوی اکرام اللہ ندوی اور انیس احمد جعفری نے بھی قابلِ ذکر سوانح عمریوں کی تصنیف کی۔

مولانا غلام رسول مہر نے ۱۹۳۶ء میں مرزا غالب کی سوانح حیات ''غالب'' کے نام سے تصنیف کی۔حاؔلی کی یادگارِ غالب کے بعد یہ غالب کی ایک اہم سوانح عمری ہے۔غلام رسول مہر نے اس کے لیے غالب کی شعری اور نثری تحریروں اور نجی تحریروں سے مواد فراہم کیا۔اپنی خصوصیات کے باعث ''غالب'' کو اردو کی سوانح عمریوں میں خاص مقام حاصل ہے۔شیخ محمد اکرام نے ''شبلی نامہ'' کی تصنیف کا کام کیا۔اس میں انہوں نے شبلی کے کلام اور خطوط کے مطالعے سے شبلی کی شخصیت کا نفسیاتی تخیل کر کے نتائج اخذ کیے۔شیخ محمد اکرام کا یہ عمل اردو میں سوانح نگاری کی روایت میں ایک نیا تجربہ تھا۔

انھوں نے شبلی نامہ کو معتدل، متوازن اور جدید سوانح نگاری کے اصولوں کے مطابق مختصر لیکن مستقل سوانح عمری کا نمونہ بنا کر پیش کیا۔انہوں نے شبلی کی کی نفسیات تک رسائی حاصل کر کے ان کی سیرت وشخصیت کے مختلف پہلوؤں اور اس کی تشکیل وتعمیر میں کارفرما اثرات کا سراغ لگانے کی سعی کی۔اس کے علاوہ انھوں نے شبلی کی شخصی کمزوریوں کو بھی غیر جانب دارانہ انداز میں بیان کیا۔شیخ محمد اکرام نے ''غالب نامہ'' کی تصنیف بھی کی۔اس دَور میں مالک رام نے غالب کی سوانح ''ذکرِ غالب'' کے عنوان سے سے تحریر کی۔اس طرح رفتہ رفتہ اردو میں سوانح نگاری کی ایک مستقل روایت قائم ہوگئی۔

اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ اہم سوانح نگار اور ان کی تصنیف کردہ سوانح عمریوں کی ایک فہرست یہاں پیش خدمت ہے۔

مصنف	سوانح عمری
﴿۱﴾ قاضی عبدالغفار	آثارِ جمال الدین افغانی، حیاتِ اجمل، آثارِ ابوالکلام آزاد
﴿۲﴾ غلام رسول مہر	سیرت سید احمد شہید، (دوجلدیں)
﴿۳﴾ صالحہ عابد حسین	یادگارِ حالی (حالی کی پہلی باضابطہ سوانح عمری)
﴿۴﴾ مولانا عبدالماجد دریابادی	محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق (دوجلدیں)
﴿۵﴾ عبدالمجید سالک	ذکرِ اقبال
﴿۶﴾ ابوسعید قریشی	منٹو

﴿۷﴾ مُلّا واحدی — سوانح عمری خواجہ حسن نظامی

﴿۸﴾ خورشید مصطفٰی رضوی — حیاتِ ذاکر حسین

﴿۹﴾ شاہ معین الدین ندوی — حیاتِ سلیمان (سید سلیمان ندوی کی سوانح عمری)

﴿۱۰﴾ پروفیسر خلیق احمد نظامی — حیاتِ شیخ عبدالحق محث دہلوی (پانچ جلدیں)

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ ''البرامکہ'' کا مصنف کون ہے؟

﴿۱۱﴾ ''امہات الامۃ'' کس کی تصنیف ہے؟

﴿۱۲﴾ افضل حسین ثابت نے کس کی سوانح عمری حیاتِ دبیر کے عنوان سے لکھی؟

02.07 خلاصہ

جدید اردو ادب میں سوانح نگاری کو ایک اہم صنف کا درجہ حاصل ہے۔ اردو میں سوانح نگاری کا با قاعدہ آغاز مولانا الطاف حسین حالؔی اور شبلؔی نعمانی نے کیا۔ انھوں نے سوانح نگاری میں مشرقی اور مغربی اصولوں کو پیشِ نظر رکھا۔ اردو میں پہلی سوانح نگاری کے اولین دھندلے نقوش قدیم دکنی مثنویوں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں لیکن بہر حال ان پر سوانح نگاری کا اطلاق نہیں ہوتا۔ دکنی مثنویوں کی طرح شعرائے اردو کے تذکروں میں سوانح نگاری کے دھندلے نقوش نظر آتے ہیں۔

اردو میں حالؔی پہلے شخص ہیں جنھوں نے سوانح نگاری کے جدید اصولوں کو بروئے کار لا کر اردو میں سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ حالؔی نے تین سوانح عمریاں تصنیف کیں ان میں حیاتِ سعدی، فارسی کے عظیم شاعر و ادیب شیخ سعدی کی سوانح حیات ہے تو یادگارِ غالب مرزا غالب کی۔ حیاتِ جاوید حالی کی تیسری سوانحی تصنیف ہے جو علی گڑھ تحریک کے بانی سر سید احمد خاں کی جامع و مفصل سوانح عمری ہے۔ حیاتِ جاوید میں حالی نے سرسید کی حیات اور ان کے کارناموں کے بیان کے ساتھ اس پورے عہد کو سمیٹ لیا ہے۔

شبلی اپنے زمانے کے قابل ترین شخصیتوں میں سے ایک تھے حالؔی کے بعد شبلؔی اردو کے دوسرے اہم سوانح نگار ہیں ہیں۔ شبلؔی اسلام کی عظمت کے جذبہ سے سرشار تھے اپنے اس جذبہ کو عملی شکل دینے کے لیے شبلی نے ناموران اسلام (ہیروز آف اسلام) کی تصنیف کا آغاز کیا اس سلسلے میں انھوں نے المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی (نامکمل) کے علاوہ حیاتِ حافظ، حیاتِ خسرو وغیرہ کی تصنیف کی۔ شبلی نے اپنی تصانیف کے ذریعے اردو میں سوانح نگاری کی ایک مستقل روایت قائم کی۔

حالؔی اور شبلؔی کی سوانح عمریوں کو عوام وخواص میں مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی تو دیگر اہلِ قلم بھی اس جانب متوجہ ہوئے ان میں مرزا حیرت دہلوی، عبدالرزاق کانپوری، احمد حسین الہٰ آبادی، مولوی ذکاء اللہ اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری وغیرہ اہم قابل ذکر ہیں۔

سوانح نگاروں کے قافلے میں آگے چل کر سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، حبیب الرحمٰن خان شیروانی، مولوی اکرام اللہ ندوی اور انیس احمد جعفری کے علاوہ مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام اور مالک رام وغیرہ نے اردو میں سوانح نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا اور اپنی تصانیف سے اس کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا۔

02.08 فرہنگ

اِجمالی	: اختصار کے ساتھ	عِلَل	: علّت کی جمع
اَجناس	: جنس کی جمع، چیز	کوائف	: کیفیت کی جمع
اَسباب	: سبب کی جمع، وجہیں	ماخذ	: منبع، وہ جگہ جہاں سے کوئی چیز نکلے
اِطلاق	: استعمال ہونا	متقدمین	: اگلے زمانے کے لوگ
تصانیف	: تصنیف کی جمع، کتابیں	مشاہیر	: مشہور کی جمع
تفصیلی	: وضاحت کے ساتھ	معاصرین	: ہم عصر
چشم پوشی کرنا	: ٹال جانا	معرکہ آرائی	: جنگ کے لیے ایک دوسرے کے مقابل آنا
رطب و یابس	: برا بھلا، خشک و تر	معزّز	: عزت دار، ممتاز
رقم کرنا	: لکھنا، تحریر کرنا	ملک الشعرا	: شاعروں کا بادشاہ
سُبُک دَوش	: بری الذمہ	نُقُوش	: نقش کی جمع، نقشہ، تصویر

02.09 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ شبلی کے حالات زندگی اختصار سے بیان کیجیے۔

سوال نمبر۲ حیاتِ سعدی میں حالی نے کیا طریقۂ کار استعمال کیا؟

سوال نمبر۳ سوانح نگاری میں حالی کے اسلوب نگارش پر روشنی ڈالیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ حالی کی سوانح نگاری پر تفصیل سے اظہار خیال کیجیے۔

سوال نمبر۲ اردو کے قدیم دور میں سوانح نگاری کے نقوش کیسے ملتے ہیں؟ بحث کیجیے۔

سوال نمبر۳ شبلی کی سوانح نگاری سے بحث کرتے ہوئے ان کے طرزِ اُسلوب پر روشنی ڈالیے۔

02.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ مختصر تاریخِ ادب اردو از ڈاکٹر سید اعجاز حسین، ترمیم و اضافے: ڈاکٹر سید محمد عقیل

۲۔ تاریخِ ادب اردو از رام بابو سکسینہ، مترجم: مرزا محمد عسکری

۳۔ اُردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا (۱۹۱۴ء تا ۱۹۷۵ء) از ڈاکٹر ممتاز فاخرہ

۴۔ اُردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا از الطاف فاطمہ

02.11 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ آثارالصنادید، خطباتِ احمدیہ، سیرتِ فریدیہ۔

﴿۲﴾ ۱۹۵۶ء

﴿۳﴾ ۱۸۸۴ء

﴿۴﴾ شیخ سعدی

﴿۵﴾ الطاف حسین حالؔی

﴿۶﴾ ۱۸۵۷ء

﴿۷﴾ ۱۸۸۹ء

﴿۸﴾ ۱۸۹۱ء

﴿۹﴾ امامِ اعظم ابوحنیفہ

﴿۱۰﴾ خواجہ عبدالرزاق کانپوری

﴿۱۱﴾ ڈپٹی نذیراحمد

﴿۱۲﴾ مرزا سلامت علی دبیر

اکائی 03 خودنوشت سوانح کا فن

ساخت

03.01 : اغراض ومقاصد
03.02 : تمہید
03.03 : خودنوشتسوانح کا معنی ومفہوم
03.04 : خودنوشت سوانح کا تاریخی پس منظر
03.05 : اردو میں خودنوشت سوانح کا فنّی ارتقا
03.06 : خودنوشت سوانح کی اقسام
03.07 : خودنوشت سوانح کا معیار
03.08 : خودنوشت سوانح کی ضرورت اور اہمیت
03.09 : خودنوشت سوانح کے متنی نمونے
03.10 : خلاصہ
03.11 : فرہنگ
03.12 : سوالات
03.13 : حوالہ جاتی کتب

03.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ خودنوشت سوانح نگاری کی تعریف اور پس منظر بیان کر سکیں گے۔خودنوشت سوانح نگاری کے تاریخی حقائق کا مطالعہ کرسکیں گے ساتھ ہی خودنوشت سوانح نگاری کے فن کا جائزہ لے سکیں گے۔خودنوشت سوانح نگاری کے اُسلوبِ نگارش سے واقفیت کرسکیں گے اور خودنوشت سوانحِ حیات کی تاریخی اور معاشرتی اہمیت کا جائزہ لے سکیں گے اس کے بعد مشہور ومعروف خودنوشت سوانح نگاروں کے متعلق جانکاری حاصل کرسکیں گے۔خلاصہ سے قبل مشہور خودنوشتوں کے اقتباس کا مطالعہ کرسکیں گے۔

03.02 تمہید

اردو میں تقریباً سبھی اصنافِ سخن انسانی جذبات،خیالات،افکار واحساسات کی ترجمانی کرتی ہیں خواہ وہ اصنافِ شعری ہوں یا نثری، لیکن ان میں زیادہ تر اصناف میں انسانی فکر کا سطحی احساس پایا جاتا ہے خواہ وہ نظم ہو یا غزل،مرثیہ ہو یا مثنوی،قصیدہ اور رباعی (سطحی سے میری مراد اجتماعی فکر اور احساسِ جمال ہے) تقریباً تمام اصنافِ شعری میں انسان کے نجی جذبات کا احساس شامل ہوتا ہے لیکن پسِ پردہ اور دوسروں

کی زبان میں۔ بیشتر نثری اصناف کا بھی حال کچھ اسی طرح کا ہے خواہ وہ داستان، ناول، کہانی، افسانہ ہو یا ڈراما، انشائیہ، خاکہ، مضمون نگاری، خطوط یا سفرنامے سبھی اصناف نثر میں انسانی فکر کا پرتو ہے۔ معاشرے کے نشیب و فراز، حُسن و خوبی، فکر و نظر، عشق و محبت، نفرت و دشمنی، اعزاز و اکرام، درد و غم اور حسرت و یاس سب کا احساس پایا جاتا ہے۔ اس میں ذاتی جذبات و خیالات اور حقائق کے ساتھ معاشرتی و معاشی افکار کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

تاہم دو ایسی اصناف ہیں جن سے انسان کی ذاتی زندگی کے حقائق کا اظہار ہوتا ہے۔ میری مراد سوانح حیات ''سوانح عمری'' اور ''خود نوشت سوانح'' سے ہے۔ سوانح حیات یا سوانح عمری کسی شخص کی ذاتی زندگی کے حقائق بے کم و کاست اور تحقیق شدہ احوال و واقعات کو اس شخص کا ہم عصر یا بعد کی نسلوں کے بعض افراد کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی کسی معروف شخصیت خواہ وہ علمی، ادبی، سماجی یا مذہبی ہو اس کے حالاتِ زندگی کی ہو بہو تصویر کشی سوانحِ حیات یا سوانح عمری میں ایمان دارانہ اور مخلصانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ خودنوشت سوانح عمری یا آپ بیتی میں کسی دوسرے شخص کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا یہ صرف اور صرف اپنی ذاتی زندگی کا مصنّف کے ذریعے ایمان دارانہ اور مسلسل لکھی گئی نثر ہے۔ آپ اس اکائی میں خودنوشت سوانح نگاری کی تفصیل کے ساتھ ہی اس کا تاریخی پس منظر، خودنوشت سوانح کا فنّی ارتقا، اس کی قسمیں، خودنوشت کی اہمیت و ضرورت اور معیاری خودنوشت کے متعلقات کا مطالعہ کریں گے۔

03.03 خودنوشت سوانح کا معنی و مفہوم

خودنوشت کو خودنوشت سوانح عمری، خودنوشت سوانح حیات اور آپ بیتی سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

انگریزی زبان میں اس کو Auto-biography کہا جاتا ہے جس کا لغوی معنیٰ Life history of a person writen by himself یا The story of one's life writen by himself ہے۔ اردو اصناف ادب میں خودنوشت سوانح عمری کو ایک معروف و مخصوص صنف کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں سوانح نگار اپنی آپ بیتی خود اپنے قلم سے لکھتا ہے۔ اس کا خودنوشتہ ایک طرف شخصی خاکہ اور مسلسل آپ بیتی ہے تو دوسری طرف اس کی حیثیت تاریخی، معاشرتی، معاشی اور عمرانی بھی ہے۔ اس فن میں طوالت اور اختصار کی کوئی قید نہیں اور نہ کسی خاص اسلوب پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ عام طور سے خودنوشت سوانح حیات ایک شائع شدہ مفصّل کتاب ہوتی ہے۔ حالاں کہ غیر شائع شدہ آپ بیتیاں بھی خودنوشت کے زمرے میں شمار ہوتی ہیں۔

خودنوشت ایسی سوانح عمری ہے جس میں کوئی شخص اپنی زندگی کے حالات خود اپنے قلم سے لکھتے ہوں گویا خودنوشت سوانح حیات میں مصوّر اپنے ہی قلم سے خود ہی صفحۂ قرطاس پر رنگ بھرتا ہے اور ارادی طور پر ایسی ایسی مصوّری کرتا ہے کہ اس کے خودنوشت نما کینوس کو دیکھ کر اس کے ہم عصر اور آنے والی نسلیں اس کی پہچان کر سکیں، اس کا جائزہ لے سکیں اور اس کی شخصیت کا تجزیہ کر سکیں۔ خودنوشت میں تمام کردار کے ایکشن کا خودنوشت نگار ہی بذات خود ہیرو ہوتا ہے۔ خودنوشت عام طور پر نثر میں لکھی جاتی ہے حالاں کہ نثر میں لکھنا کوئی بنیادی شرط نہیں لیکن نثر کے میدان میں قلم کا سپاہی زیادہ تیز اور کئی جانب اپنے گھوڑے دوڑا سکتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کئی شخصیتوں نے نظم میں بھی خودنوشت لکھنے کی کامیاب کوشش کی ہیں جن میں منیّر شکوہ آبادی اور واجد علی شاہ کا نام بطورِ خاص لیا جا سکتا ہے۔

معروف انسائکلو پیڈیا برٹانیکا میں خودنوشت سوانح حیات کی صفات اس طرح بیان کی گئی ہے:

''خودنوشت سوانح حیات کسی ایسے شخص کی ایسی سوانح حیات ہے جو خود اس نے لکھی ہو اس کے محرکات مختلف ہوتے ہیں منجملہ دیگر باتوں کے اخلاق واصلاح کے لئے اپنے آپ کو پرکھنا اپنے افعال کی تاویل کرنا، حسین یادوں اور پرانی باتوں کو تروتازہ کرنے کی کوشش اس عقیدے کے ساتھ ممکن ہے کہ اس کے تجربات دوسرں کے لئے معاون ہوں۔ اُلجھی ہوئی دنیا میں اپنے ذات کی واضح سمت متعین کرنے کی پرشوق کوشش فن کارانہ اظہار کی تمنا یا شہرت اور رتبے سے فائدہ اُٹھانے کی خالصتاً کاروباری کوشش''

Autobiography is the biography of a person writen by himself. Its motivations are various, among others self scrutiny for selfedification, self-justification, a nostalgic desire to linger over enchanting memories. Belief that one's experience may be helpful to others, an earnest attempt to orient self-amid a world of confusion, the urge of artistic expression or the purely commercial desire to capitalize on fame or position.

(بحوالہ صبیحہ انور، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، نامی پریس لکھنو صفحہ ۲۱)

خودنوشت لکھتے وقت مصنف عصری اور سماجی روایات، تاریخی حقائق اور حالات وواقعات کو ایک داستان کی شکل میں واحد متکلم کے پیرائے میں لکھتا ہے۔ خودنوشت میں مصنف کی خارجی اور داخلی زندگی کا عکس اور اس کا منظر وپس منظران تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اُجاگر ہوتا ہے۔ خودنوشت سوانح حیات میں اتنا ہی تنوّع اور رنگارنگی نظر آتی ہے جتنا مصنف کی زندگی میں، خودنوشت لکھنے کے لئے نہ صفحات کی تعداد متعین ہے اور نہ اس کے لئے بندھے ٹکے اصول تاہم وہ خودنوشت سوانح عمریاں فنی اعتبار سے جامعیت کی حقدار ہوتی ہیں جن میں صنفی فنکاری کے ساتھ ساتھ سچائی اور شخصیت کا پرتو ہو۔

03.04 خودنوشت سوانح کا تاریخی پس منظر

انگریزی ادب کی تاریخ میں اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ انگریزی سے پہلے جرمن زبان میں خودنوشت لکھنے کا رواج رہا ہوگا۔ اس کا عندیہ جرمن شاعر اور مفکر جے. جی ہرڈر کا مجموعہ "Self Biographies of Famous Men" دیتا ہے۔ قرین قیاس ہے کہ ۱۷۹۶ء سے ۱۷۹۹ء کے درمیان اس کو ترتیب دیا گیا۔ ۱۸۰۹ء میں Robert-Southey کا ایک مضمون پرتگالی ادب کے ایک سہ ماہی (Quarterly Review) میں کسی پرتگالی مصوّر کی فراموش شدہ خودنوشت کتاب پر تبصرہ شائع ہوا تھا۔ یورپی ممالک کے ساتھ مشرق بعید کے کئی ممالک میں خودنوشت سوانح حیات جیسی تدوین شدہ تحریریں ملتی ہیں جن کا شمار سوانح حیات میں کیا جا سکتا ہے۔ مغرب میں سینٹ آگسٹن (St Augustine) کے تعلق سے رومانی نوعیت کی خودنوشت کی ابتدا کا ذکر زبان وادب کی تاریخ میں عام طور سے درج ہے۔

سید شاہ علی اپنی کتاب ''اردو میں سوانح نگاری'' میں لکھتے ہیں:

''سینٹ آگسٹن کے اعترافات میں مذہبی جذبات سے پیدا شدہ پیچیدہ داخلی خودنوشت سوانح حیات کی ابتدا کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ایک عظیم دماغ کے انکشافات ہیں۔ سینٹ آگسٹن کے بعد نشاط ثانیہ تک کوئی قابل

ذکر نام نہیں ملتا۔ 75-1570 میں گارڈن کی Devitapropria داخلی خودنوشت کا ایک سائنسی نمونہ ہے۔ اس نے انسانی اوصاف اور عادات کے تحت اپنی خصوصیات کا اس ایمان داری سے جائزہ لیا ہے کہ بقول ایک نقاد کے جدید علم نفسیات سے اس کا وہی رشتہ ہے جو گلی لیو کا علم ہیئت سے ہے۔''

(سید علی شاہ : اُردو میں سوانح نگاری ،صفحہ ۶۷ بحوالہ ڈاکٹر صبیحہ انور ،اُردو میں خودنوشت سوانح حیات۔ نامی پریس لکھنو۱۹۸۲)

مغرب میں گبن (Gibbon) ہرڈر (Hurder) اور گوئٹے خودنوشت لکھنے والوں کی حیثیت سے بہت معروف ہوئے۔ روسو نے بھی نفسیات اور سماجیات کے پس منظر میں اپنی خودنوشت سوانح حیات لکھا ہے۔ روسو کی خودنوشت سوانح حیات کو خودنوشت کی صنف میں اس کی جرأت و بے باکی کی وجہ سے جمہوری رجحان کا علمبردار کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی مثال گاندھی جی کی تصنیف My Experiment with Truth سے دی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر صبیحہ انور نے اپنی کتاب ''اردو میں خودنوشت سوانح حیات'' میں انگریزی کے تیرہ معروف خودنوشت نگاروں اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ انگریزی میں کسی ہندوستانی کی پہلی آپ بیتی لطف اللہ نے ۱۸۵۴ء میں لکھی۔ جو ۱۸۵۷ء میں شائع ہوئی۔ لطف اللہ کے بعد رکھالا داس ہلدر کی خودنوشت ۱۸۶۱ء میں The English Diary of an Indian Student کے نام سے لکھی۔ ۱۸۷۳ء میں ایک ریٹائر فوجی سیتارام نے From Sepoy to Subedar (سپاہی سے صوبے دار تک) نام سے خودنوشت لکھی جو کافی معروف و مشہور ہوئی۔

اس کے علاوہ ۱۸۹۲ء میں نیشی کانت چٹوپادھیائے، ۱۹۰۵ء میں مسٹر اے بال کرشن مدالیار، ۱۹۰۸ء میں لالہ لاجپت رائے اور ۱۹۱۹ء میں شیام سندر چکرورتی نے خودنوشت سوانح عمریاں لکھیں۔ ۱۹۱۷ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کی آپ بیتی کی اشاعت خودنوشت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر، پی سی رائے، جواہر لعل نہرو، ملک راج آنند، ہرندر ناتھ چٹوپادھیائے، سروپلی رادھا کرشنن، نیتا جی سبھاش چندر بوس، نیرادسی چودھری، مرزا اسماعیل بیگ، ایورسٹ کی اولین فاتح ٹینزین اور مولانا آزاد، پی ایس مینن، ستارنواز روی شنکر، صحافی فرنگ موریس کے بیٹے ٹام موریس وغیرہم انگریزی میں خودنوشت لکھنے والے معروف ہندوستانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں ہندوستانیوں کی انگریزی خودنوشتوں کے علاوہ دوسری زبانوں مثلاً فارسی وغیرہ میں بھی خودنوشت یا آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں جن میں حضرت امیر خسرو کی ''فتوحات فیروزشاہی''، ظہیرالدین بابر کی ''تزک بابری'' یا ''بابرنامہ'' اولین حیثیت کے حامل ہیں۔ تزکِ بابری کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے اور بہت حد تک اس میں حقیقت بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ بابر کی اسی خوبی کی وجہ سے اسے ''خود نوشت نگاروں کا شہزادہ'' کہا جاتا ہے۔ بابر کی اس میراث کو آگے بڑھانے والوں میں اس کی بیٹی گل بدن کا نام لیا جا سکتا ہے جس نے ''ہمایوں نامہ'' لکھا۔ بابر کے پرپوتے جہانگیر نے ''اقبال نامہ'' لکھ کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا۔ جہانگیر کے عہد کا ایک فوجی جنرل علاءالدین اصفہانی عرف مرزا ناتھن نے ''بہارستانِ غیبی'' کے نام سے اپنی خودنوشت لکھی۔ مقامی زبان میں آپ بیتی لکھنے والوں میں جین شاعر بنارسی داس کا نام سرِفہرست ہے۔ بنارسی داس نے اپنی سرگزشت کا نام ''اردھ کتھا (نصف کہانی)'' کو ۱۹۴۱ء میں تحریر کیا۔ اردھ کتھا بنارسی داس کی پچپن سالہ زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ مقامی زبان میں شعوری طور پر لکھی جانے والی خودنوشت سوانح حیات میں اسے مکمل خودنوشت کا درجہ حاصل ہے۔

اٹھارہویں صدی کے اختتام پر خودنوشت کو ایک آزاد اور قابل قدر صنف کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔اس زمانے میں مسلمان اپنی آپ بیتیاں زیادہ تر فارسی زبان میں لکھتے تھے۔ برطانوی دَورِ حکومت میں انگریزی، فارسی اور اردو میں خودنوشت لکھنے کا رواج عام ہوتا گیا۔

اُردو میں روزنامچے، خطوط، سفرنامے، رپورتاژ اور ڈائریاں خودنوشت نگاری کے لئے خام مواد فراہم کرتی ہیں۔خودنوشت سوانح حیات اپنی زبان میں کہانی لکھنے کا فن ہے اور اس میں فنکار کی ذات پردہ پوشی کے باوجود باہر جھلکتی ہے۔روزنامچوں، سفرناموں، شخصی تاثرات اور ڈائریوں سے شعوری وغیر شعوری اظہارِ خیال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اردو میں مولوی مظہر علی سندیلوی اور خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے خودنوشت کا مزہ دیتے ہیں۔خواجہ حسن نظامی کی معروف تصانیف میں ان کے روزنامچے کی موجودگی اس کے مظہر ہیں۔مولوی مظہر علی سندیلوی کا روزنامچہ جو ۱۹۱۱ء میں پورا ہوا تھا۔ یہ ۷۷۹۹ صفحات پر مشتمل ہے۔اس نادر و نایاب روزنامچے کا تعارف ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے کرایا اور اس کے صرف اقتباسات کو پونے دوسو صفحات میں پیش کئے۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اس روزنامچے کے ذیل میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ بیک وقت ایک تاریخ بھی ہے ایک سوانح عمری بھی اور زندگی کی داستان بھی۔''

اس روزنامچے میں خودنوشت سوانح عمری کے جزئیات کی نشان دہی کرتے ہوئے مزید لکھا ہے:

''تاریخی وتمدنی حیثیت سے قطع نظر یہ ایک مکمل سوانح عمری ہے۔مولوی صاحب کی زندگی کے تمام پہلو مثلاً سعی روزگار، ترقی کی کوشش، زمانے کی سازگاریاں و ناسازگاریاں، اپنا کیریکٹر، خیالات، عادات و اعتقادات، اپنی خوبیاں اور کمزوریاں غرض کہ زندگی کا ہر گوشہ اجاگر ہے۔مولوی صاحب سال کے اختتام پر اپنی زندگی کا محاسبہ اور دنیا کے حالات پر تبصرہ ضرور کرتے، یہ تبصرہ بھی دل چسپی سے خالی نہیں ہیں۔''

(نورالحسن ہاشمی، ایک نادر روزنامچہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء، ص ۱۸)

03.05 اُردو میں خودنوشت سوانح کا فنی ارتقا

اردو کی دوسری اصناف کے مقابلے خودنوشت سوانح نگاری کا فن زیادہ توجہ کا طالب ہے کیوں کہ اس صنف میں خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔خودنوشت سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے اس صنف کے فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔حالاں کہ یہی ابتدائی نمونے خودنوشت سوانح کے فنی ارتقاء کی بنیاد بھی فراہم کرتے ہیں۔خودنوشت سوانح کے ابتدائی نمونے عام طور سے غیر واضح اور نامکمل ہیں۔غالباً اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ان خودنوشت سوانح نگاروں کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا۔

خودنوشت سوانح نگاری کا فن بحیثیت ایک صنف کے ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد وجود میں آیا حالانکہ اردو میں اس سے قبل نظم ونثر دونوں میں خودنوشت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔اس کی مثال دکن وشمال کی متعدد مثنویوں سے دی جاسکتی ہے۔حالاں کہ خودنوشت سوانح عمری کے معیار و میزان پر یہ پوری نہیں اُترتیں مثلاً میر تقی میر اور واجد علی شاہ نے جو مثنویاں لکھی ہیں ان سے ان کے شب وروز اور زندگی کے نشیب وفراز اور اس زمانے کے سماجی ومعاشرتی مذاق کا پتہ چلتا ہے۔نثر میں صوفیائے کرام کے ملفوظات سے ان کے حالاتِ زندگی اور زمانے کے نشیب و فراز کا پتہ چلتا ہے نیز مختلف سماجی، تہذیبی وتاریخی حقائق بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن انہیں بھی خودنوشت سوانح نگاری کے فن پر پرکھا جاسکتا۔جیسا

کہ آپ جان چکے ہیں کہ اس زمرے میں مثنویوں کے علاوہ ڈائریاں وخطوط وروز نامچے بنیاد فراہم کرتے ہیں مثلاً مرزا غالب اور دیگر شعراء و ادبا کے خطوط لیکن ان میں سوانح نگاری کے فن کا فقدان ہے۔

آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ اردو میں خودنوشت سوانح عمریوں سے قبل شعرا فارسی میں سوانح عمریاں لکھتے تھے مثلاً امیر خسرو نے اپنے حالات زندگی کو نہایت ترتیب وسلیقے سے ''غرۃ الکمال'' اور ''تحفۃ العصر'' میں بیان کیا ہے۔میر تقی میر کی شہرہ آفاق خودنوشت سوانح حیات ''ذکرِ میر'' کے علاوہ فارسی کی کئی خودنوشت سوانح کے متعلق مثلاً بابر، جہانگیر وغیرہ کی لکھی سوانح عمریوں کے بارے میں آپ جان چکے ہیں۔

اردو میں باضابطہ پہلی خودنوشت سوانح عمری مولانا جعفر تھانیسری کی تصنیف ''تواریخِ عجیب'' ہے۔گو کہ اس میں بھی سوانح نگاری کی خصوصیات کا فقدان ہے لیکن اس کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اردو میں خودنوشت سوانح حیات میں ظہیر دہلوی کی خودنوشت ''داستانِ غدر'' کو خصوصیت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔کیوں کہ غدر سے پیدا شدہ حالات اور ادبی وتہذیبی اور ذاتی وسماجی زندگی کی پر اثر تصویر کشی ''داستانِ غدر'' میں ملتی ہے۔اس کا سنِ اشاعت ۱۹۱۰ء ہے۔

۱۸۸۴ء میں عبدالغفار خاں نساخ نے اپنی خودنوشت سوانح عمری آپ بیتی کے نام سے لکھی۔فنّی وادبی نقطۂ نظر سے سوانح عمری کی کسوٹی پر یہ خودنوشت پوری نہیں اُترتی تاہم اپنی پرلطف اندازِ بیان اور دلکش وپراثر اُسلوب کی وجہ سے خودنوشت کی تاریخ میں اسے اہم مقام حاصل ہے۔خودنوشت سوانح عمری میں خواجہ حسن نظامی کی خودنوشت ''آپ بیتی'' ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی اس کا اسلوب نہایت عمدہ اور اثر انگیز ہے۔اردو کی خودنوشت سوانح نگاری کی تاریخ میں خواجہ حسن نظامی کو اہم حیثیت حاصل ہے۔

۱۹۱۹ء میں ہی ''تذکرہ'' کے نام سے مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت سوانح حیات سامنے آئی گو کہ مولانا آزاد عبارت آرائی اور دلکش شاعرانہ اسلوب کے لئے مشہور ہیں اور متعدد حقائق ان کے خوب صورت الفاظ کے پردے میں چھپ جاتے ہیں تاہم بیسویں صدی کے صاحبِ طرز ادیب کا یہ نایاب تحفہ ہے۔''آپ بیتی'' کے عنوان سے ہی ظفر حسن ایبک کی خودنوشت ۱۹۴۹ء میں سامنے آئی۔اس خودنوشت کے سلیس اسلوب اور عام فہم ہونے کے باوجود اس میں مقامی وبین الاقوامی سیاسی حالات، ادبی ومذہبی افکار ونظریات کو فن کارانہ ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔اردو خودنوشت سوانح نگاری کی صنف میں سر رضا علی کی خودنوشت سوانح عمری ''اعمال نامہ'' بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔یہ خودنوشت ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی کم وبیش اسی دَور کی ایک اور خودنوشت ''خوں بہا'' کے نام سے ۱۹۴۵ء میں حکیم احمد شجاع نے لکھی ہے۔

خودنوشت سوانح نگاری کی تاریخ میں مولانا حسین احمد مدنی کی خودنوشت سوانح حیات ''نقشِ حیات''، علمی، ادبی اور قومی تاریخ میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔آزادی کے بعد شائع ہونے والی خودنوشت سوانح عمریوں میں سردار دیوان سنگھ مفتون کی خودنوشت ''ناقابل فراموش'' واقعی ناقابلِ فراموش ہے۔ہوش بلگرامی کی خودنوشت ''مشاہدات'' کے نام سے ۱۹۵۵ء میں سامنے آئی۔اس خودنوشت میں حیدر آباد کے سیاسی حالات اور مصنف نے اپنی نجی حالات زندگی کو فن کارانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

۱۹۵۸ء میں معروف غزل گو شاعر شاد عظیم آبادی کی خودنوشت سوانح عمری ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' شائع ہوئی۔خودنوشت کے فنی ارتقا میں عبدالمجید سالک کی خودنوشت سوانح عمری ''سرگزشت'' اور ڈاکٹر یوسف حسین خان کی خودنوشت ''یادوں کی دنیا'' بالترتیب ۱۹۶۷ء میں اشاعت پذیر ہوئیں۔مجموعی طور پر انہیں خودنوشت سوانح عمری کی صنف میں منفرد حیثیت حاصل ہے۔شورش کاشمیری غالباً اردو کے اکیلے

خودنوشت سوانح نگار ہیں جنھوں نے ''پسِ دیوارِ زنداں''، ''نغمۂ خدمت''، ''موت سے واپسی'' اور ''بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل'' چار خودنوشتیں لکھی ہیں۔

خودنوشت سوانح کی تاریخ میں جوشؔ ملیح آبادی کی خودنوشت ''یادوں کی برات'' ۱۹۷۰ء، خواجہ غلام السیدین کی خودنوشت ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'' ۱۹۷۵ء کلیم الدین احمد کی ''اپنی تلاش'' ۱۹۷۵ء احسان دانش کی ''جہانِ دانش'' ۱۹۷۵ء معروف مزاحیہ نگار مشتاق احمد یوسفی کی خودنوشت سوانح ''زرگزشت'' ۱۹۷۶ء ڈاکٹر اعجاز حسین کی ''میری دنیا''، قرۃ العین حیدر کی ''کارِ جہاں دراز ہے'' اختر الایمان کی ''اس آبادخرابے میں''، سید عطا حسین کی ''ایک سویلین کی سرگزشت''، بیگم انیس قدوائی کی ''آزادی کی چھاؤں میں''، جگن ناتھ آزاد کی ''میرے شب و روز''، ابن انشا کی ''آوارہ گرد کی ڈائری''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری، اور ہمایوں مرزا کی میری کہانی میری زبانی'' خود نوشت سوانح کی فنی ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

عہدِ حاضر میں خودنوشت کے فنی ارتقا میں دوسرے اصناف ادب کے مقابلے بہت کم اور غیر اطمینان بخش کام ہوا ہے۔ خودنوشت سوانح حیات لکھنے کے لئے جس ذہنی چابک دستی اور معاشی آسودگی کی ضرورت ہوتی ہے ممکن ہے اردو کے ادبا کو وہ آسانیاں حاصل نہ ہوں۔ خودنوشت نگاری کے فن میں ذہنی ریاضت، مشاہدات و تجربات، پختہ ادبی شعور اور مختلف علوم وفنون کی بھی واقفیت درکار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودنوشت تصانیف کی تعداد کم ہے اور جو لکھی بھی گئی ہیں ان میں ادبی پختگی اور توازن کا فقدان نظر آتا ہے تاہم موجودہ دَور میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

03.06 خودنوشت سوانح کی اقسام

آپ نے مطالعہ کیا کہ اردو زبان میں خودنوشت سوانح حیات کی صنف دیگر زبانوں بالخصوص فارسی سے ماخوذ ہے۔ دوسری زبانوں کی بہت سی خودنوشت سوانح عمریوں کا ترجمہ بھی اردو میں کیا گیا ہے اور ان کی تلخیص بھی شائع ہوتی رہی ہے۔ اردو کے علاوہ معروف زبانوں مثلاً انگریزی اور فارسی وغیرہ میں بھی خودنوشت سوانح عمریاں اپنے فن پر پوری نہیں اُترتیں۔ اردو میں متعدد خودنوشت سوانح عمریوں کا یہی حال ہے۔ بعض دفعہ خودنوشت کچھ مخصوص مقاصد کے تحت تحریر کی جاتی ہیں جو خودنوشت کے صنفی معیار سے میل نہیں کھاتیں، کچھ ادھوری خود نوشت لکھی گئی ہیں تو کچھ بغرض مجبوری اور کچھ اپنی ذات کی تشہیر کے لئے۔

جو خودنوشتیں اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں ان میں روسو کی ''اعتراف'' (انگریزی)، گاندھی جی کی ''تلاشِ حق'' (انگریزی)، طٰہٰ حُسین کی ''الایّام'' (عربی)، واجد علی شاہ اختر کی ''عشق نامہ'' (فارسی) وغیرہ خاص ہیں۔ مذکورہ سبھی خودنوشتوں کو مکمّل خودنوشت نہیں کہا جا سکتا۔ اغراض و مقاصد اور تکمیل کے لحاظ سے خودنوشت سوانح حیات کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں لیکن یہاں ان کی دو قسموں کا تذکرہ نہایت ضروری ہے یعنی تکمیلی لحاظ سے خودنوشت سوانح حیات کی دو قسمیں ہیں:

ایک مکمّل خودنوشت دوسری نامکمّل خودنوشت سوانح حیات:

﴿۱﴾ **مکمل خودنوشت:** چوں کہ خودنوشت کسی فرد واحد کے تجربات و مشاہدات اور خیالات و جذبات کی عکاس ہوتی ہے اور اگر یہ عکاسی اس کی پوری طبعی عمر پر محیط ہو اور زندگی کے سبھی نشیب و فراز اور نفسیاتی کیفیات کا مکمّل

طور سے اس میں اِحاطہ کیا گیا ہو نیز اس میں مصنف کے عہد کی سماجی، معاشرتی، ادبی اور دیگر رجحانات کا پوری طرح تجزیہ کیا گیا ہو اور مصنف کی پیدائش سے تکمیلِ حیات تک کا تذکرہ اسی معیار سے شامل ہو تو اسے مکمّل خودنوشت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

اردو میں مکمّل خودنوشت کے زمرے میں جن خودنوشتوں کو شامل کیا جا سکتا ہے ان میں سر رضا علی کی خودنوشت ''اعمال نامہ''، دیوان سنگھ مفتون کی ''نا قابل فراموش''، شاد عظیم آبادی کی ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی''، حکیم احمد شجاع کی ''خوں بہا'' اور جوشؔ ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات'' خاص ہیں۔ حالاں کہ یوسف حسین خاں کی خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی دنیا'' کو بھی مکمل خودنوشت کے زمرے میں ہی رکھا جانا چاہئے۔ یہ تمام خودنوشت سوانح عمریاں اپنے مصنّفین کی نمایاں خدوخال، ان کی امتیازی خصوصیات اور ان کے احساس و جمال کا مشاہدہ قاری کو کراتی ہیں۔ ان تمام خودنوشتوں میں مصنّفین کے ذاتی احوال کے علاوہ ان کے عہد کے تمام اقدار و افکار اور معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی عناصر پوری طرح جلوہ گر ہیں۔ یہی نہیں ان مصنّفین نے اپنے معاصرین اور عزیز و اقارب کے جذبات و احساسات، نفسیاتی کیفیات اور تجربات و مشاہدات کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔

﴿۲﴾ نامکمّل خودنوشت سوانح حیات: نامکمّل خودنوشتیں، خودنوشت نگاروں کی زندگی کے کسی خاص پہلو، کسی خاص دَور یا اہم کارنامہ کی تفصیل پیش کرتی ہیں۔ ان میں مکمّل خودنوشتوں جیسی مصنّفین کی پوری زندگی کا لیکھا جوکھا نہیں ہوتا۔ کئی مصنّفین نے اپنی زندگی کے کسی خاص دَور کے اہم واقعہ یا نفسیاتی، جذباتی اور معاشرتی پہلوؤں کا تذکرہ و تعارف پیش کیا ہے۔ ایسی تصانیف کو خودنوشت کے زمرے میں تو رکھا جا سکتا ہے لیکن انہیں مکمّل خودنوشت سوانح حیات کا درجہ حاصل نہیں۔ ایسی خودنوشت سوانح حیات میں جعفر تھانیسری کی ''کالا پانی''، ظہیر دہلوی کی ''داستانِ غدر''، مولانا ابوالکلام کی خودنوشت ''تذکرہ''، چودھری افضل حق کی ''میرا افسانہ''، خواجہ حسن نظامی کی ''آپ بیتی''، چودھری خلیق الزماں کی ''شاہراہِ پاکستان''، شورش کاشمیری کی ''بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل''، ہوش بلگرامی کی ''مشاہدات''، مشتاق احمد یوسفی کی ''زرگزشت'' اور عبدالماجد دریا آبادی کی ''آپ بیتی'' بطور خاص ہیں۔ ان کے علاوہ شوکت تھانوی کی ''مابدولت'' اور ''کچھ یادیں کچھ باتیں''، سبطِ حسن کی ''شہرِ نگاراں'' اور مرزا ظفر الحسن کی تصنیف ''ذکرِ یار چلے'' کو بھی اسی زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان خودنوشتوں، آپ بیتیوں میں مصنّفین کی زندگی کے مخصوص عہد یا حالات یا اس زمانے کے واقعات کہیں تفصیل اور کہیں اجمال کے ساتھ درج ہیں۔ حالاں کہ مذکورہ خودنوشتوں میں صنف خودنوشت نگاری کی چیدہ چیدہ خوبیاں پائی جاتی ہیں تاہم ان میں ایک مبسوط نوشت کے سارے عناصر کی شمولیت نہیں۔ اس طرح کی تمام تحریروں وتصنیفوں کو خودنوشت کے صنف میں نامکمّل خودنوشت سوانح حیات کہنا بہتر ہے۔

03.07 خودنوشت سوانح کا معیار

خودنوشت سوانح حیات کو بعض نقّادوں نے نیم تخلیقی صنف ادب قرار دیا ہے۔ یہ ایک بیانیہ صنف ہے جس میں ادبیت کے ساتھ ساتھ تاریخی صداقت، جمالیاتی کیفیت اور خود اظہاریت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کی زبان تخلیقی اور ادبی ہونی چاہئے۔ مصنّف کا موقع کی نزاکت کے لحاظ سے حزنیہ، مزاحیہ، بیانیہ، خود بیانیہ، سنجیدہ اور طنزیہ ہر طرح کا اسلوب اختیار کرنا خوبی کہی جا سکتی ہے۔ عام طور سے خود نوشت کا مصنف اپنی شخصیت اور اپنے حالات سے دوسروں کو روشناس کراتا ہے۔ اپنی زندگی میں گزرنے والے مختلف حالات و تجربات، اپنے

زمانے کے سیاسی، سماجی، ادبی رجحانات پر اپنے زاویۂ نگاہ سے اور اپنے آدرشوں کی کسوٹی پر پرکھ کر دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے اور ان کو ترغیب دلاتا ہے۔ ایک بہتر خودنوشت نگار اپنے تعلقات، اپنے اعمال وافعال پر خود ہی تنقیدی نظر ڈال کر اپنے ہم عصروں اور آنے والی نسلوں تک اپنی زندگی کے نشیب وفراز سے واقف کرانے کی کوشش کرتا ہے۔

خودنوشت سوانح حیات کی تصنیف مصنّف کے اِردگرد ہی گردش کرتی ہے۔ متعدد واقعات وحالات اور اپنی ذات کے کمالات کو مختلف اندازِ بیان اور پیرایہ میں ڈھال کر پیش کرتا ہے لیکن کیا ہر خودنوشت سوانح عمری لکھنے والا ان سبھی باتوں کا ایمان داری سے اندراج کر سکتا ہے؟ خودنوشت کی ایک اہم کمزوری یہ ہوتی ہے کہ اس میں مصنّف جن خوبیوں کا مالک ہوتا ہے اس سے زیادہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

خودنوشت نگاری کی خوبیوں اور خامیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے **Auto-biography** کے مصنف بر **(Burr)** نے لکھا ہے:

''ارادے سے لکھی ہوئی خودنوشت بڑی ناکام صنف ہے اس میں ملمّع زیادہ ہوتا ہے۔ اظہار کے نام سے اِخفا کیا جاتا ہے اور لوگوں کو دھوکا دیا جاتا ہے کہ میں پرلے درجہ کا راست گو اور راست باز ہوں۔''

کسی شخص کو بالحقیقت اپنی ہی شخصیت اور انفرادیت کو سمجھنا زیادہ مشکل ہے کیوں کہ انسانی شعور کو کسی میکانیکی عمل یا کسی مخصوص سانچے میں نہیں ڈھالا جاسکتا اور نہ کسی میزان پر تولا جاسکتا ہے۔ کسی انسان میں ردّوقبول کا مادہ، تحت الشعور کی پیچیدگیاں اور نفسیاتی عمل اور ردِّعمل ایسی چیزیں ہیں جس کا اندازہ لگانا اس شخص کے لئے ناممکن ہے تو پھر کوئی دوسرا اس سے کیوں اندازہ لگا سکتا ہے۔ خودنوشت میں مصنّف خود ہی کوزہ ہوتا ہے اور کوزہ گر بھی اور خود ہی اس کے توڑنے کا مجرم بھی۔ خود ہی جرم کرتا ہے، خود ہی گواہی دیتا ہے اور خود ہی منصفی بھی کرتا ہے۔ خودنوشت میں مصنّف کے پیشِ نظر عمومی اور خصوصی صداقت اور سچائی کی جستجو ہونی چاہئے، اگر وہ ایسا ہوتا تو اپنا منصف خود بن سکتا ہے اور گواہ بھی۔

روسو جو خودنوشت کا شہرہ آفاق مصنّف ہے اس نے اپنی خودنوشت میں اس کے اصول اور سچائی کے تئیں نہایت صدق دل سے اعتراف کرتے ہوئے اپنی تصنیف کی ابتدا میں لکھا ہے:

''میں نے ایک مہم کا بیڑا اُٹھایا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں اور شاید دوسرا آدمی اس کی تقلید (کی جرأت) بھی نہ کر سکے گا۔ میں کشتۂ تقدیر مخلوق (بنی نوع) کے سامنے ایک انسان کی تصویر رکھ رہا ہوں اور یہ انسان کون ہے؟ میں خود ہوں، میں اپنے دل کے بھید جانتا ہوں۔ میں نے دوسرے انسانوں کو بھی دیکھا ہے۔ میں ان میں سے کسی جیسا نہیں۔ ان سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھ میں کچھ ندرت ضرور ہے۔ کیا فطرت نے مجھے جس سانچے میں ڈھالا ہے اس کو خود ہی توڑ کر کوئی اچھا کام کیا؟ اس کا فیصلہ میری کتاب کو پڑھ کر ہی کیا جاسکے گا۔ میں نے سچائی اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے عیب وہنر کو بیان کیا ہے۔ میں نے اپنا کوئی جرم نہیں چھپایا۔ میں نے اپنی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کیا۔ اور اگر کہیں کہیں میں نے زیبِ داستان کا ارتکاب کیا ہے تو محض اس وجہ سے کہ بعض بعض موقعوں پر میری یاد نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ لہٰذا مجھے وہ خلا پُر کرنے پڑے۔ عین ممکن ہے کہ میں نے بعض ایسی باتوں کو یقین سمجھ لیا ہو جو احتمالی تھیں۔

لیکن میں نے جان بوجھ کر جھوٹ کو سچ نہیں کیا۔ میں جیسا بھی تھا ویسا ہی میں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ کبھی بُرا اور کبھی قابلِ نفرت، کبھی نیک طبیعت، کشادہ دل اور رفیق۔ میرے بنی نوع میرے ان اعترافات کو سُنیں ۔میری پستی پر شرمائیں، میرے دُکھ پر کانپ جائیں اور اگر ان میں سے کسی میں جرأت ہو تو وہ اسی خلوص اور جرأت کے ساتھ اپنے دل کو ٹٹولے۔ اور اگر کہہ سکتا ہو تو صاف صاف کہہ دے کہ میں اس آدمی (روسو) سے بر تر آدمی ہوں''

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو نثر کا فنی ارتقا، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۱ء ص: ۳۵۵-۳۵۶)

اگر بے لاگ سچائی خودنوشت سوانح نگاری کی شرطِ اوّل ہے تو روسو کے نیت اور ارادے پر شبہ نہیں، اس کی تحریر میں خلوص کے ساتھ ساتھ خوف بھی پایا جاتا ہے گویا اس کے مطابق ایک اچھے مصنّف کے لئے ضروری ہے کہ مصنّف بیرونی ملامت یا تحسین کی وجہ سے کچھ نہ چھپائے اور داخلی و خارجی دباؤ سے بے نیاز ہو کر ہر وہ بات کہ ہو بہو نقل کرے جو اس پر گزری ہے۔ یوں تو انگریزی کے دیگر خودنوشت نگاروں نے روسو کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی لیکن اکثر اپنے آپ کو ناکامی سے نہ بچا سکے۔

گوئٹے کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں لیکن اس نے اپنی خودنوشت میں جو حقائق اپنی زندگی کے متعلق بیان کئے ہیں درحقیقت سچائی سے کوسوں دور ہیں اور مبالغہ آرائی سے نزدیک تر۔ گوئٹے نے اپنی ولادت کے واقعات جس انداز اور فلسفیانہ نظر سے پیش کیا ہے وہ سچائی سے پرے معلوم ہوتا ہے کوئی شخص اپنی پیدائش کے وقت اس لائق نہیں ہوتا کہ اس کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر سکے۔ دوسرے کی زبانی اس روداد کو بیان کیا جا سکتا ہے جو اکثر خودنوشت نگاروں نے کیا ہے۔

روسو، گوئٹے کے مقابلے میں اپنی ولادت کا ذکر کرتے ہوئے اعتدال سے کام لیتا ہے۔ اس نے لکھا ہے:

"My birth cost my mother her life and was the first of my misfortune. I am ignorant how my father supported her loss at that time but I know he was ever after inconsulable."

ذاتی تأثر پیش کرنے میں دیانت داری اور سچائی بڑا مشکل کام ہے لیکن خودنوشت نگار کے قلم کے لئے دیانت داری کو اپنا محرم و راز دار بنانا اور بھی مشکل ہے، وہ مصنف جو روسو کی تقلید نہیں کرتے وقتی طور پر فائدے میں رہتے ہیں لیکن صنفی طور پر تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔ اس سلسلے میں فرائڈ کی نامکمل خودنوشت جو روسو کی طرح ایمان داری اور بڑی سادگی سے لکھی ہے اپنی فکری جمال اور بیانیہ انداز سے ایک بہتر نمونہ ہے۔ بعض خودنوشت سوانح عمریاں لکھنے والے مصنّفین اپنے خودنوشت کے مسودے کو اپنی زندگی میں مقفّل کر دیتے ہیں اور ورثا کو وصیّت کر جاتے ہیں کہ یہ کتاب میرے وفات کے بعد شائع کی جائے۔ دراصل ایسی تصانیف یا تو اپنی تعریف آپ ہوتی ہیں یا شدید جذباتی رویے کی حامل یا پھر اپنے ہم عصروں کے خلاف چناں چہ اس طرح کی وصیّتیں حفظِ ماتقدّم کے طور پر لکھی جاتی ہے کیوں کہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنی تعریف میں جھوٹ کے پلندے اور دوسرے کے تعصّبات کا طعنہ اور مخالفت اپنی زندگی میں نہ جھیل پائے۔ بہرحال خودنوشت میں سبھی طرح کی سچائیوں کا اظہار بلاخوف وتردّد اپنی زندگی میں کرنا چاہئے تاکہ ہم عصروں کو اور آنے والی نسلوں کو افہام وتفہیم کا موقع مل سکے گویا آپ بیتی ذاتی جلوہ گری اور نمود ونمائش یا دوسروں پر چھپ کر حملہ کرنے کا ذریعہ نہیں ہونا چاہئے۔

03.08 خودنوشت سوانح کی ضرورت اوراہمیت

خلاّقِ کائنات نے انسان کو دنیا کی سب سے باشعور مخلوق پیدا کیا۔ابتدائے آفرینش سے ہی انسان نے اپنے اوراپنے آس پاس موجودکرتیجُر کے متعلق سوچنا شروع کیا۔فلسفیوں کا خیال ہے کہ اگرانسان خوداپنے متعلق غوروفکرکرےاوراپنے آپ کو جاننے کی کوشش کرے تو وہ خالق کائنات تک پہنچ سکتا ہے گوکہ یہ راستہ قدرے مشکل ہے لیکن چلنے والے چلتے ہیں، ڈھونڈنے والے ڈھونڈتے ہیں اور پانے والے پا بھی جاتے ہیں۔انسانی اقدار،انسانی حوصلے اور کچھ نیا کرنے کے تجسّس نے انسانوں کونئی نئی چیزوں اورمشکل حالات پرقابوپانے کے لائق بنا دیا۔انسان اپنے آپ کو پہچاننے کی،اپنے نفسیات کا تجزیہ کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہاہےاور یہ اگر خالق کائنات تک نہ بھی پہونچ سکےتو اپنے آپ کو پہچان کردوسروں کے لئے مشعل راہ بن جاتا ہے۔بقول علامہ اقبالؔ:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

گویا اپنی تلاش میں،اپنی حقیقت کی تلاش میں انسان ہمیشہ سرگرداں رہاہے اسی تلاش وجستجو کی وجہ سے بہت سارے فلسفیانہ اور نفسیاتی اصول سامنے آئے۔اسی تلاش وجستجو نے انسان کو اپنی تاریخ وتہذیب اور تمدّن لکھنے پر اُکسایا تاکہ آنے والی نسلیں اس سے سبق حاصل کریں اوراسے نشانِ راہ کے طور پراستعمال بھی کریں۔عمرانیات انسانی تہذیب وتمدن اوراس کے حقائق جاننے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔آپ جان چکے ہیں کہ انسانوں کے حقائق جاننے کے لئے ان کی روددادیں، ڈائریاں، روزنامچے،سفرنامے،خطوط وغیرہ کا استعمال کیا جاتا رہاہےاسی ضمن میں فن سوانح نگاری کا نام لیا جاسکتا ہے۔

فن سوانح نگاری کودوحصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

ایک وہ جوکسی شخصیت پراس کے بعد یااس کے ہم عصراشخاص خامہ فرسائی کریں اوراس شخص کی مختلف النوع شخصیت،انفرادیت، عادات واطواراوردل چسپیاں جاننے کی کوشش کریں ان کے ادبی،سیاسی اورسماجی رجحانات کا پتہ لگائیں تاکہ عوام النّاس کے اورنئی نسلوں کے سامنےان کی شخصیات کا پرتوواضح ہوجائے۔

سوانح کی دوسری شکل یہ ہے کہ شخصیات خود ہی اپنے متعلق خامہ فرسائی کریں، اپنی زندگی کے نشیب وفراز، اپنی خصلتیں،اپنی عادتیں،اپنے رجحانات اوردوسروں کے متعلق اپنے خیالات بقلم خودکریں۔ایسی سوانح کوخودنوشت سوانح حیات کہتے ہیں۔

دنیا کی حقیقت کوسمجھنے کے لئے انسان نے دوذرائع اختیار کیے ہیں۔کچھ چیزوں کا مشاہدہ ہم خارجی طور پرکرتے ہیں اور کچھ کا داخلی طور پر۔جب ہم اپنی ذات کااوردنیا کی حقیقتوں اوروسعتوں پرغورکرتے ہیں تو اپنی ذات بالکل حقیر معلوم ہوتی ہےاور پھرمتعدّد سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں مثلاً میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ کیسا ہوں؟ کیوں ہوں؟اوراسی طرح کے متعدد سوالات نئے نئے زاویوں سے اُبھرتے رہتے ہیں انسان ان میں سے کچھ کا جواب دے پاتا ہےاور کچھ کا نہیں۔کبھی اس کے پاس جواب ہوتا ہےلیکن وہ دنیا کونہیں بتانا چاہتا۔

خودنوشت سوانح اظہارِذات کا بہترین ذریعہ ہے۔خودنوشت لکھنے والے کی سوچ وفکر،تبسم،ڈر،خوف،عدل وانصاف اورتمام نفسیاتی پہلوخودنوشت میں سامنے آتے ہیں۔

بقول غلام رسول مہر:

''نفس معلومات صحیحہ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو آپ بیتی کو ہر دوسرے ذخیرۂ تاریخی اور ابنائے عبرت پر ترجیح حاصل ہے۔''

(غلام رسول مہر، آپ بیتی کی اہمیت نقوش، لاہور، جون ۱۹۶۴ء، ص:۳۸)

خودنوشت یا آپ بیتی کے لکھنے کا منجملہ محرکات اپنی اور ہم عصر سماج کی اخلاقی اصلاح بھی ہے اور اپنے تجربات کے ذریعہ دوسروں کی معاونت بھی۔ خودنوشت سوانح حیات کبھی کبھی اپنی ذات وشخصیت سے بے پناہ محبت کی وجہ سے بھی وجود میں آتی ہے یہ ایک نفسیاتی اصلاح کا اچھا وسیلہ ہے، خودنوشت سوانح حیات کی ضرورت دوسری اصنافِ سخن مثلاً ناول، افسانہ ونظم سے زیادہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان آپ بیتی یا خودنوشت پوری زندگی میں ایک ہی بار لکھتا ہے جب کہ دوسری اصناف نظم ونثر بار بار لکھے جا سکتے ہیں۔

خودنوشت سوانح حیات لکھنے والی، شخصیتوں کے نفسیاتی پہلو کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہوئی۔ اس کی طبیعت، ذہنی میلان، ادبی رجحانات، ذہنی اُلجھنیں، بصیرت آموز تجزیات سے آگے آنے والی نسلوں کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ خودنوشت نگار اپنی زندگی کے تمام نہاں خانے سے پردے اُٹھا کر اپنا کلیجہ کاغذ پر نکال کر رکھ دیتا ہے، کسی خودنوشت سے مفید مطلب نکالنا اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا ذہنی ونفسیاتی امراض کے ڈاکٹر کے مانند ہے کہ وہ مریض سے کہتا ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کہے، جو بیان کرتا ہے کرے، بے تکان بولے اور پھر ان سبھی بیانات کی کڑیوں کو آپس میں جوڑ کر ذہنی مرض کی تشخیص کرتا ہے۔ ٹھیک یہی کام باشعور قاری آپ بیتی یا خودنوشت سے مصنف کے متعلق جو حقائق حاصل کرنا چاہتا ہے کر لیتا ہے گویا خودنوشت سوانح حیات کے پڑھنے والوں کو صرف تصنیف کے سطور کو نہیں لکھنے والی شخصیت کے بین السطور کو بھی پڑھنا چاہئے، کبھی کبھی خودنوشت کا مصنّف نفسیاتی طور پر اپنے فعل کی عذر خواہی یا تعلّی کرتا ہے یا کسی کی ہجو کرتا ہے اور کسی امر کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے تو ان سطور میں وہ چبا چبا کر باتیں کرتا ہے، باشعور قاری بخوبی اندازہ لگا لیتا ہے کہ یہاں دال میں کالا ہے۔ خودنوشت سوانح حیات میں مصنف اپنے ہر عمل میں کوئی نہ کوئی نفسیاتی وجہ رکھتا ہے جس میں کبھی فخر، کبھی پشیمانی، کبھی اُمید و نا اُمیدی اس کی تحریر سے جھلکتی ہے۔ پڑھنے والے کو مصنّف کی نفسیاتی ذہانت کا اور اس کی کمزوریوں و پسندیدگیوں کا اندازہ لگ جاتا ہے۔

یوں تو خودنوشت سوانح عمری کسی فردِ واحد کی آپ بیتی ہوتی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ کوئی تصنیف خلا میں نہیں لکھی جاتی، اس میں مصنّف کی زندگی کے ذاتی تجربات ومشاہدات کے ساتھ ساتھ اس کے تاثرات بھی معلوم ہوتے ہیں وہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی ومعاشرتی حالات کا جائزہ بھی لیتا ہے، کبھی ان حالات سے اثر قبول کرتا ہے اور کبھی اثر ڈالتا ہے، تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں صرف اس زمانے کے حالات کا خاکہ سمجھ میں آتا ہے۔ خودنوشت سوانح عمری سے مؤرخ کے نقطۂ نظر اور مخصوص اور مختلف ذریعہ سے کھینچی ہوئی سماجی، معاشی، ادبی اور علمی سرگرمیوں کی تصویر نظر آتی ہے اور اس تصویر کے ذریعہ ہم اس عہد کے اندر تک پہونچ سکتے ہیں۔ یہ کورچشمی کہی جائے گی کہ ہم تاریخوں کا مطالعہ کرتے وقت بادشاہوں وحکمرانوں کی فتح وشکست کی داستانیں پڑھیں اور عوامی زندگی کا تجزیہ نہ کریں اور ان کے مختلف علمی وثقافتی پہلوؤں کا اندازہ نہ کریں ان پہلوؤں کا اندازہ خودنوشت سوانح سے لگایا جا سکتا ہے۔

خودنوشت سوانح حیات کا مطالعہ صرف ادیب اور زبان کے طلبا کے لئے ہی نہیں، تاریخ کے طالب علم کے لئے بھی اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے تا کہ اس زمانے کے موٹے موٹے حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ اس عہد کے عوام النّاس کی زندگی کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جا سکے چناں چہ تہذیب وتمدّن، رسم ورواج، عادات واطوار اور آدابِ محفل کی جتنی صحیح اور جامع تصاویر خودنوشتوں سے مل سکتی ہے بڑی بڑی تاریخ کی کتابوں سے ملنا مشکل ہے۔

03.09 خودنوشت سوانح کے متنی نمونے

﴿۱﴾---- داستان غدر---- ظہیر دہلوی--- ۱۸۵۷ء

تمامی سرگزشت بطورِ سوانح عمری روزِ ولادت تا زمانہ شیخوخیت راست، راست بے کم وکاست بلا تصنع اور بلا مبالغہ بلا تصرّف اور بلا تحریف جو حوادث سر پر گزرے اور جو واقعات مدّت العمر میں پیش آئے ہیں قلم برداشتہ بقیدِ تحریر لائے جاتے ہیں۔ کسی کی توہین و مذمت وستائش و مدحت سے سروکار نہیں۔ اپنی جانب سے تبدیل اور تحریف کو روا نہیں رکھا جو واقعات میری نظر سے گزرے اور بیانات کہ میں نے اپنے کان سے سنے اسی طرح درج صحیفہ کئے ہیں۔ مثلاً ایّامِ غدر میں جو معرکۂ جنگ کے حالات زبانی مردمان فوج باغیر میرے گوش گزار ہوئے وہ ہی لکھتا ہوں اور بازاری گپوں کا اعتبار نہیں اس سے مجھے احتراز ہے۔

﴿۲﴾---- تذکرہ---- مولانا ابوالکلام آزاد--- ۱۹۱۹ء

جتنی زندگی گزر چکی ہے گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمود غبار سے زیادہ نہیں اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوہ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ قلم درماندہ تذکرہ ونگارش سے عاجز اور فکر گم گشتہ، حیران اظہار وتعبیر اپنی سرگزشت اور روداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک نمود غبار وجلوہ سراب کی تاریخ حیات قلم بند ہو تو کیونکر ہو؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں۔ ہوا میں غبار اُڑتا ہے طوفان نے درخت گرادیے سیلاب نے عمارتیں بہادیں۔ مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے تنکے تنکے جمع کئے۔ خرمن وبرق کا معاملہ۔ آتش وخس کا افسانہ۔ ان سب کی سرگزشتیں لکھی جاسکتی ہیں تو لکھ لیجئے۔ میری پوری سوانح عمری بھی انہیں میں مل جائے گی۔ نصف افسانہ امید اور نصف ماتم یاس۔

﴿۳﴾---- آپ بیتی---- ظفر حسن ایبک--- ۱۹۴۹ء

انگریزوں کے پنجاب پر قابض ہوجانے کے بعد بھی یہ جماعت چندہ جمع کرنے اور نئے ممبر بنانے کی کوشش کرتی رہی چناں چہ اسی ذیل میں ہمارے رشتہ دار مولوی محمد جعفر صاحب جو تھانیسر ضلع کرنال کے رہنے والے تھے اس جماعت کے لئے خفیہ چندہ جمع کر کے سرحدی علاقوں کو بھیجا کرتے تھے ایک نوکری کی غداری کی وجہ سے انگریزوں نے ان کو کالے پانی جزیرۂ انڈمان بھیج دیا بعد میں ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی کی ساٹھویں سال گرہ پر ان کو رہائی ملی اور وہ کرنال آگئے تھے۔ میں نے ان کو کئی دفعہ جب میں بہت چھوٹی عمر کا تھا دیکھا تھا اور ان کو (چچاجی) کہہ کر پکارا کرتا تھا۔

﴿۴﴾---- نقشِ حیات---- مولانا حسین احمد مدنی---۱۹۵۲ء

چوں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ زمانہ ہائے سابقہ میں اسلافِ کرام نے اپنی سوانح عمریاں خود لکھی ہیں اور زمانۂ حال میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں اس کی بکثرت مثالیں پائی جاتی ہیں اور چونکہ آپ بیتی اور سرگزشت سے انسان جس قدر واقف ہوتا ہے دوسرا نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کوئی وجہ اس تذکرہ کو ترک کرنے کی نہیں معلوم ہوتی ہے خصوصاً اس بنا پر کہ اُمید ہے کہ شاید لوگوں کو صحیح حالات معلوم ہونے کی بنا پر کچھ نفع پہنچے یا کم از کم وہ ان بدظنیوں اور بدگوئیوں سے پرہیز کریں جو دشمنانِ دین و مذہب نے اپنی خودغرضیوں کے تحت یوروپین پروپیگنڈے سے پھیلائی ہیں۔

﴿۵﴾---- شادؔ کی کہانی شادؔ کی زبانی---- شادؔ عظیم آبادی---۱۹۵۸ء

اپنے اور استاد کے مُطمحِ نظر کے اسی اختلاف سے میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ یہ سوانح جیسے چاہئے استاد کی زندگی میں شائع نہیں ہوسکتے میں اس سے ہاتھ دھوکر بیٹھ گیا۔ آخر ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ سید صاحب نے مبسوط سوانح حیات میری طرف سے صیغہ غائب میں لکھ کر اس کا نام ''کمالِ عمر'' رکھا اور یہ غیر صاف شدہ مسودہ سیکڑوں صفحوں پر محیط کر کے میرے حوالے کر دیا۔ مجھے بڑا سکون اور اطمینان ہوا کہ ایک مشکل حل ہوگئی۔ اپنے قلم سے حیاتِ شاد میں واقعات تبصرہ تنقید میں کسی اونچ نیچ پاس داری یا صاف گوئی کا الزام میرے سر نہ رہے گا۔ بڑا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اس کتاب کا نام استاد نے ''کمالِ عمر'' رکھا تھا مجھے اس نام میں اصل موضوع کی طرف انتقالِ ذہن کی صفت نظر نہ آئی اسی لئے میں نے ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' کے نام سے موسوم کیا۔''

03.10 خلاصہ

اس اکائی میں آپ نے اردو نثر کی ایک معروف صنف خودنوشت سوانح حیات کے متعلق معلومات حاصل کی۔ آپ نے خودنوشت سوانح عمری کے معنی و مفہوم کے تحت یہ جان لیا کہ انگریزی میں اس کا لغوی معنی Autobiography ہے۔ جس کا مفہوم Life history of a person written by himself ہوتا ہے۔ The story of one's life,written by himself خودنوشت سوانح میں کوئی شخص اپنی زندگی کے حالات خود قلم بند کرتا ہے جس میں اس کے محرکات، اخلاق، فکر، عقیدہ، نظریہ اور شخصیت کے دوسرے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس میں مصنّف کے خارجی و داخلی زندگی کا عکس اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔

مغربی زبان میں سب سے پہلے جرمن شاعر اور مفکّر جے جی ہرڈرک نے اس صنف کو ۱۷۹۶ء سے ۱۷۹۹ء کے درمیان متعارف کروایا۔ اس کے بعد St.Augustine نے رومانی نوعیت کی اپنی خودنوشت لکھی۔ ہندوستانی مصنفین نے بھی انگریزی زبان میں کئی خودنوشتیں لکھیں جن میں گاندھی جی، رکھالا داس ہلدار، سیتارام ابتدائی لکھنے والوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ رابندرناتھ ٹیگور، محمد علی جوہر، جواہر لعل نہرو، ملک راج آنند، رادھا کرشنن اور مولانا آزاد نے بھی انگریزی زبان میں خودنوشتیں لکھی ہیں۔

ہندوستان میں فارسی زبان میں بھی خودنوشتیں اور آپ بیتیاں لکھی گئیں جن میں امیر خسرو کی ''فتوحاتِ فیروز شاہی''، ''غرۃ الکمال''، ''تحفۃ العصر''، ظہیر الدین بابر کی ''تزکِ بابری'' اور جہانگیر کی ''اقبال نامہ'' زیادہ معروف ہیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اردو خودنوشت سوانح نگاری کو ایک مکمّل صنف کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا حالاں کہ اس سے قبل شمال و جنوب میں نظم ونثر دونوں میں خودنوشت سوانح عمری لکھنے کا چلن تھا۔ خودنوشت سوانح عمری کی باضابطہ تصنیف مولانا جعفر تھانیسری کی ''تواریخِ عجیب'' ہے، اس کے علاوہ اردو میں خودنوشت سوانح عمری کے زمرے میں ظہیر دہلوی کی خودنوشت ''داستانِ غدر''، خواجہ حسن نظامی کی ''آپ بیتی''، مولانا ابوالکلام آزاد کی ''تذکرہ''، ظفر حسین ایبک کی ''آپ بیتی''، سر رضا علی خان کی خودنوشت سوانح ''اعمال نامہ''، مولانا حسین احمد مدنی کی ''نقش حیات'' معروف خودنوشتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ ہوش بلگرامی، شاد عظیم آبادی، عبدالمجید سالک، یوسف حُسین خاں، جوش ملیح آبادی، شورش کاشمیری، کلیم الدین احمد، احسان دانش، خواجہ غلام السیدین، رشید احمد صدیقی اور قرۃ العین حیدر معروف خودنوشت سوانح نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

عام طور سے خودنوشت سوانح کی دو قسمیں مکمّل خودنوشت اور نامکمّل خودنوشت سوانح حیات ہیں۔ خودنوشت کی زبان نہایت سلیس اور تخلیقی وادبی ہونی چاہئے، موقع محل کے لحاظ سے مصنف کو مزاحیہ، بیانہ، خود بیانیہ، سنجیدہ اور حُزنیہ اسلوب اختیار کرنا چاہئے۔ خودنوشت سوانح عمری لکھنے والا اگر ایمان دار ہو تو اس کے عہد کی عکّاسی اور اس کی شخصیت سے متعلق معلومات آنے والی نسلوں کو آسانی سے مل سکتی ہیں۔ گویا بے لاگ سچائی خودنوشت سوانح نگاری کی شرطِ اوّل ہے، عالمی سطح پر روسو، گوئٹے اور فرائڈ کی خودنوشت سوانح عمریاں زیادہ مشہور ہیں۔

معاشرتی اور عمرانی حقائق کا مطالعہ کرنے کے لئے خودنوشت سوانح بہت مفید ثابت ہوتی ہیں، کبھی کبھی خودنوشت سوانح حیات اپنی ذات کو برتر بنانے اور اپنی شخصیت کو اُجاگر کرنے کے لئے بھی لکھی جاتی ہے ایسی خودنوشتیں اپنے صنف سے انصاف نہیں کرتیں اور پڑھنے والا فوراً مصنّف کی خامی اور مقاصد کو بھانپ لیتا ہے۔ کسی زمانے کی معاشی، سماجی، ادبی اور علمی سرگرمیوں کی صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے خودنوشت سوانح حیات تاریخ کی بڑی بڑی کتابوں سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں۔

03.11 فرہنگ

اِحتمالی	: شک وشبہہ، وہم وگمان، قیاس کیا ہوا	عندیہ	: رائے، منشا، ارادہ، منصوبہ
بے کم وکاست	: بالکل درست، ٹھیک ٹھیک، کمی بیشی کے بغیر	کینوس	: کرمچ، تصویر، یا نقاشی کے لئے استعمال کی جانے والی ٹاٹ، (Canvas)
تاویل	: شرح، بیان، ظاہری مطلب سے کسی بات کو پھیر دینا، بچاؤ کی دلیل، حیلۂ شرعی	مبسوط	: پھیلا ہوا، کشادہ، فراخ
تشہیر	: مشہور کرنا، شہرت دینا، بدنام کرنا، رسوا کرنا	محاسبہ	: حساب، شمار، پڑتال، حساب کے متعلق پوچھ گچھ
خامہ فرسائی کرنا	: لکھنا، تحریر کرنا		
راست گو	: سچ بولنے والا، صاف گو	محرّکات	: حرکت دینے والے، اسباب پیدا کرنے والے، اُبھارنے واُکسانے والے
ریاضت	: محنت مشقّت، نفس کشی، کسرت، ورزش		

سراغ	:	پتہ، کھوج، تلاش	ملمّع	:	قلعی، ظاہری ٹپ ٹاپ۔ بناوٹ، دکھاوا
عمرانی	:	معاشرتی، سوسائٹی سے متعلق، انسانی آبادی سے متعلق	نشاۃ ثانیہ	:	کسی ملک یا قوم کا ازسرِ نَو ترقی کرنا، دوبارہ عروج پانا
عمل پیرا ہونا	:	عمل کرنا، کام کرنا	نشیب و فراز	:	اونچ نیچ، اُتار چڑھاؤ

03.12 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر ۱ مکمل خودنوشت پر اظہار خیال کیجیے۔

سوال نمبر ۲ نامکمل خودنوشت سوانحی تصنیفات بتلایئے۔

سوال نمبر ۳ خودنوشت سوانح کی اہمیت وضرورت بتلایئے۔

سوال نمبر ۴ خودنوشت سوانح نگاری کا مفہوم اپنے الفاظ میں لکھیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر ۱ خودنوشت سوانح کا تاریخی پس منظر کیجیے۔

سوال نمبر ۲ اردو میں خودنوشت سوانح کا فنی ارتقاء پیش کیجیے۔

سوال نمبر ۳ خودنوشت سوانح کے معیار ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

03.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو میں خودنوشت سوانح حیات، نامی پریس، لکھنؤ ۱۹۸۲ء از ڈاکٹر صبیحہ انور

۲۔ اُردو نثر کا فنّی ارتقا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۳۔ جوش ملیح آبادی بحیثیت نثر نگار، ۱۹۹۸ء از ڈاکٹر جعفر عسکری

۴۔ اردو خودنوشت، فن وتجزیہ، لبرٹی آرٹ پریس، دہلی ۱۹۸۹ء از ڈاکٹر وہاج الدین علوی

✵

اکائی 04 خودنوشت سوانح نگار

ساخت

04.01 : اغراض ومقاصد

04.02 : تمہید

04.03 : آزادی سے قبل کے اہم خودنوشت سوانح نگار

04.04 : آزادی کے بعد کے اہم خودنوشت سوانح نگار

04.05 : خلاصہ

04.06 : فرہنگ

04.07 : سوالات

04.08 : حوالہ جاتی کتب

04.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اُردو کے معروف خودنوشت سوانح نگاروں کے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے۔ آزادی سے قبل اور بعد کی خودنوشت سوانح نگاری کا جائزہ لے سکیں گے۔ خودنوشت سوانح نگاروں کی تحریروں کے ذریعے ان کے عہد کی سرگرمیوں سے متعارف ہوسکیں گے۔ قدیم وجدید خودنوشت سوانح نگاروں کے اُسلوبِ تحریر سے روشناس ہوسکیں گے۔ عہد جدید کے خودنوشت سوانح نگاروں کے فنّی اور صنفی رجحان کا جائزہ لے سکیں گے۔ سوانح نگاری اور خودنوشت سوانح نگاری کے فرق کو واضح کرسکیں گے۔

04.02 تمہید

اُردو زبان وادب میں مختلف صنفِ سخن انسانی جذبات وخیالات، نظریات اور محسوسات کی عکّاسی کرتے ہیں تاہم کچھ ایسی اصنافِ ادب ہیں جن میں معاشرتی اور تاریخی حقائق کے ساتھ ساتھ مصنّفین کے اپنے نجی حالاتِ زندگی اور ان کے ذاتی محسوسات وتعلقات کی عکاسی ہوتی ہے ان صنفِ سخن میں سوانح حیات اور خودنوشت سوانح حیات کا اہم مقام ہے۔ خودنوشت سوانح حیات کا مطالعہ اپنے اندر کئی مسائل و مشکلات رکھتا ہے۔ اس صنفِ ادب کا مطالعہ کرنے والا ہر قدم پر شکوک وشبہات اور ادبی خدشات سے دوچار ہوتا رہتا ہے کہ آیا خودنوشت نگار نے اپنی تصنیف میں اپنے حالاتِ زندگی اور اپنے عہد کی عکّاسی بے کم وکاست کی ہے یا اس میں خوش گپی، لغویات اور مصلحت آمیزی یا دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ عالمی سطح پر اُردو سے پہلے مختلف زبانوں میں خودنوشت سوانح عمریاں لکھی جاتی رہی ہیں۔ ان خودنوشتوں میں بھی کم وبیش قاری کو انہیں شکوک وشبہات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ گویا خودنوشت سوانح حیات کو منجملہ انسانی خصائل (نیک وبد سچ وجھوٹ) کا مجموعہ سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ ایک باشعور قاری اپنی ذہنی پختگی کے ذریعہ کسی بھی خودنوشت سوانح عمری سے بہتر اقدار اور حقائق کا پتہ لگالیتا ہے۔

خودنوشت سوانح حیات بحیثیت ایک صنف کے اپنے اندر ایک خاص دل چسپی اور دل کشی رکھتی ہے۔اس میں معاشرتی افادیت کے کئی نمایاں پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں۔اس اکائی میں آپ اُردو کے معروف ومشہور خودنوشت سوانح نگاروں کے متعلّق خصوصی معلومات حاصل کریں گے ساتھ ہی ان مصنّفین کی اُسلوب نگارش سے بھی روشناس ہوں گے۔اس اکائی میں خودنوشت سوانح کی تدریجی ترقّی کو پیش نظر رکھتے ہوئے آزادی سے قبل کے خودنوشت سوانح نگاروں کا جائزہ لیا جائے گا اور آزادی کے بعد عہدِ جدید میں خودنوشت سوانح لکھنے والوں کے فن کا خصوصی مطالعہ شامل ہوگا۔

04.03 آزادی سے قبل کے اہم خودنوشت سوانح نگار

اس سے قبل کی اکائی نمبر گیارہ میں آپ خودنوشت کی معنویت، اہمیت اور اس کے آغاز وارتقا سے متعلق جانکاری حاصل کر چکے ہیں آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ اردو زبان میں ۱۸۵۷ء سے قبل کوئی باضابطہ خودنوشت کی تحریر نہیں ملتی ہاں جابجا نظم ونثر میں چیدہ چیدہ کچھ تحریریں ملتی ہیں جن سے مصنّف کے ذاتی احوال اور اس کے عہد پر روشنی پڑتی ہے۔کچھ اولیا کرام اور صوفیائے کرام کی ملفوظات میں بھی اس قبیل کی تحریریں موجود ہیں۔یہ بات بھی اُردو زبان وادب کی تاریخ سے واضح ہوجاتی ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل خودنوشت سوانح حیات کو ایک مکمل صنف کا درجہ نہیں مل سکا تھا تاہم ۱۸۸۶ء/۱۸۸۷ء میں عبدالغفور نسّاخ کی سوانح عمری خودنوشت کی صورت میں موجود ہے جسے دستیاب خودنوشتوں میں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔

اس ذیلی اکائی میں ہم ۱۸۵۷ء سے قبل کے خودشت نگاروں میں سے چند معروف ومشہور مصنّفین کا تذکرہ کریں گے۔

﴿۱﴾ **عبدالغفور نسّاخ:** عبدالغفور کو عام طور سے اردو خودنوشت سوانح کے اوّلین مصنّفین میں شمار کیا جاتا ہے۔نسّاخ کی خودنوشت مخطوطے کی شکل میں موجود ہے۔یہ خودنوشت نامکمّل خودنوشتوں کے زمرے میں شمار کی جاتی ہے چوں کہ نسّاخ کی وفات ۱۸۸۸ء میں ہوئی تھی اور انہوں نے اپنا چوتھا اور آخری دیوان ارمغانی کے نام سے ۱۸۸۶ء میں شائع کیا اس دیوان میں نساخ نے اپنی خودنوشت کا تذکرہ کیا ہے۔یہ خودنوشت کسی وجہ سے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکی اور اس میں ۱۸۸۶ء تک کے ہی واقعات درج ہیں لہٰذا اس کی سنہ تصنیف بعض محقّقین نے ۱۸۸۶ء ہی قرار دیا ہے۔نسّاخ نے اپنی خودنوشت میں واقعات کی ترتیب کو تسلسل سے بیان نہیں کیا ہے چناں چہ جگہ جگہ واقعات کی کڑیاں آپس میں نہیں ملتیں۔نسّاخ نے اپنی خودنوشت عمر کے آخری ایّام میں مکمّل کرنے کی کوشش کی ہے اور جس قدر ان کی یادداشت نے ساتھ دیا ہے۔تفصیلات بیان کئے ہیں۔بعض جگہ دل چسپ بیانات ہیں اور بعض واقعات دل چسپی سے خالی ہیں۔اپنے بچپن کے اساتذہ کا ذکر انہوں نے پرلطف انداز میں کیا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> ''گھر پر پڑھانے کے لئے ایک مولوی مسمی اظہر علی سلہٹی مقرر کئے گئے۔یہ نہایت تیز مزاج اور چڑچڑی طبیعت کے آدمی تھے بچوں کو اکثر بےقصور پیٹا کرتے تھے۔''
>
> (ڈاکٹر محمد صداء الحق، نساخ حیات اور تصنیف۔انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۷ء بحوالہ ڈاکٹر صبیحہ انور، اُردو میں خودنوشت سوانح حیات ۱۹۸۲ء ص ۱۸۷)

نسّاخ کے استاد اظہر علی نسّاخ کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھتے جو دوسرے طلبا کے ساتھ کچھ دنوں تک نسّاخ نے برداشت کیا پھر ایک دن روتے ہوئے اپنے چچا قاضی محمد صابر کے گھر چلے آئے وہاں بھی مولوی صاحب ان کی خبر لینے پہنچ گئے ۔نسّاخ نے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ردِ عمل ظاہر کیا۔اس کا ذکر کرتے ہوئے نسّاخ نے لکھا ہے۔

''وہ بید لے کر مجھے مارنے آئے میں نے جلد شمشیر میان سے نکال کر ان پر حملہ کیا وہ بھاگے۔ یہاں تک کہ دکان کے دروازے سے سڑک پر نکل گئے اور شمشیر عریاں بکف دھاوا کرتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے دو تین سو قدم گیا بعدِ ازاں پھر آیا۔ استاد ایک لنگی پہنے ہوئے تھے اور ننگے پاؤں، ننگے سر تھے ان کے ہاتھ میں ایک بید تھا اس روز کے بعد میں نے ان کو نہیں دیکھا۔'' (ایضاً)

نسّاخ ایک ذہین طبع اور کئی علوم کے جاننے والے تھے انہیں رمل، علم نجوم، فن خطاطی وغیرہ سے بے حد لگاؤ تھا۔انھوں نے ان کا تذکرہ اپنی خودنوشت میں جابجا کیا ہے۔نسّاخ کی سیاحت بھی کم دل چسپ نہ تھی انہوں نے مختلف صوبوں اور خطّوں کے لوگوں کے رہن سہن کے بارے میں بھی ذکر کیا ہے۔نساخ نے اپنے زمانے کی معاصرانہ چشمکوں اور مشاعروں کا حال اور معاصر شعرا، ادبا کا ذکر بھی اپنی خودنوشت میں چٹخارے لے کر کئے ہیں۔ دِلّی کے سفر میں نسّاخ کی ملاقات مفتی صدارلدین آزردہ، ضیاالدین خاں نیّر درخشاں، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ اور الطاف حسین حالیؔ کے علاوہ مرزا غالبؔ سے ہوئی۔اس ملاقات کا ذکر بھی نساخ نے اپنی خودنوشت میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

''مرزا غالبؔ نے ایک دن مجھ سے کہا مولوی معلوم ہوتا ہے کہ میری طرح تم بھی سات آٹھ برس کی سن سے شعر کہتے ہوگے میں نے کہا کہ ہاں اور عید کے روز مرزا صاحب نے اپنی مثنوی ''گہر بار'' کی تین چار سَو شعر میرے سامنے پڑھے اس پر اہل دہلی کو بڑا اتعجّب ہوا کہ مرزا صاحب نے پانچ، چھ برس سے کوئی شعر کسی کے سامنے نہیں پڑھے تھے بلکہ اگر ان سے کوئی شعر پڑھنے کے لیے کہتا تو ناراض ہوجاتے تھے۔''

(نقوش لاہور، جون ۱۹۶۴ء صفحہ نمبر ۵۳۴، عبدالغفور نسّاخ)

نسّاخ نے شعرا کے اذکار اور علمی ذوق کے تذکروں کے ساتھ اپنے عہد کی سماجی و معاشرتی حالت کا ذکر بھی بڑے چاؤ سے کیا ہے۔ نسّاخ کی خودنوشت میں ان کی معاشی تگ ودَو مختلف علاقوں میں انتظامی تبدیلی، لکھنؤ، دِلّی اور عظیم آباد کے سفر کے حالات کی تفصیل پر روشنی پڑتی ہے۔کہیں کہیں نسّاخ نے کچھ ہم عصروں کی بے جا تعریف کی ہے اور موصوف میں وہ خوبیاں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو ان میں کہیں پائی نہیں جاتیں اس سے نسّاخ کی بے اعتدال طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔تاہم نسّاخ پہلے خودنوشت نگار ہیں جن کی تصنیف پڑھنے کے بعد قاری کو ان کی ہمہ گیر شخصیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔نسّاخ کی خودنوشت سے ان کی مختلف تصانیف کا عندیہ ملتا ہے۔انہوں نے اپنی جن تصانیف کا ذکر کیا ہے ان میں دفترِ بے مثال، اشعارِ نسّاخ، سخنِ شعرا، گنج تاریخ، چشم فیض اور انتخاب نقص خاص ہیں چنانچہ گوں ناگوں خوبیوں اور تفصیلات کی بنا پر خودنوشت سوانح کی تاریخ میں نسّاخ کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔

﴿۲﴾ مولانا جعفر تھانیسری: اُردو زبان وادب میں مولانا جعفر تھانیسری کی حیثیت ادبی نہیں ہے۔ان کو دل چسپی تحریکِ جہاد کے علاوہ مذہب وقانون میں تھی آپ جان چکے ہیں کہ خودنوشت سوانح حیات کی دو قسمیں ہوتی ہیں مکمّل خودنوشت اور نامکمّل خودنوشت۔مولانا کی خودنوشت ''تواریخِ عجیب'' کو اگر شعوری طور پر لکھی گئی خودنوشت سوانح حیات نہ بھی کہا

جائے تو اسے جزوی یا نامکمّل خود نوشت سوانح Partial Autobiography تو ضرور کہنا چاہئے۔ایک بات اور مولانا کی اس تصنیف کی وقعت میں اضافہ کرتی ہے وہ یہ کہ اس سے پہلے اُردو کی نثری صنف میں ان قبیل کی کوئی صنف موجود نہیں اور نثر کی زبان بھی سلیس نہیں تھی اس لحاظ سے مولانا کی خود نوشت اُردو نثری ادب کے ذخیرے میں وقیع اضافہ ہے۔مولانا جعفر تھانیسری کی خود نوشت ''تواریخِ عجیب'' جزیرہ انڈمان میں (جسے کالا پانی کہا جاتا تھا) ۱۸ر سال قید کے دوران لکھی گئی تصنیف ہے حالاں کہ تواریخِ عجیب کے علاوہ انھوں نے دو اور کتابیں بھی اس دوران لکھی جن میں تحریکِ جہاد کے رہنمائے اعظم سید احمد بریلوی کی سوانح عمری سوانح احمدی بھی شامل ہے۔

ہندوستان کے کئی رہنماؤں نے کالا پانی میں قید و بند کی زندگی گزاری اور وہاں کے حالات بھی قلم بند کئے لیکن مولانا تھانیسری کی تصنیف میں وہاں کے حالات کی جو تصویر کشی کی گئی ہے اس کی روداد واقعی عجیب ہے۔جس میں ایک ہنگامہ خیز روحانی زندگی سے لے کر قید و بند کی صعوبتیں، انڈومان کے قدیم باشندوں کے رہن سہن، بول چال، عادات واطوار، عمر قید پانے والے دیگر قیدیوں کی نفسیاتی، عمرانی تفصیلات اور نجی زندگی کی دل چسپ روداد شامل ہے، انھوں نے اپنی خود نوشت میں جو واقعات تحریر کئے ہیں۔وہ زندگی کی نیرنگیوں اور قاری کے لیے شروع سے اخیر تک دل چسپیوں سے بھری ہوئی ہے۔۱۸۶۳ء کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''۱۱ر دسمبر ۱۸۶۳ء کو ایک سوار پولیس متعیّنہ چوکی پانی پت کرنال مسمّٰی غزل خاں ایک ولایتی افغان نے کسی ذریعہ سے میرے حال سے واقف ہو کر ایسے وقت میں اپنی دنیوی بھلائی کا موقع جان کر ایک لمبی چوڑی اور جھوٹی کیفیت خیر خواہانہ کے ساتھ بحضور صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضری ہو کر یہ مخبری کی کہ جنگ جو ہندوستانی مجاہدوں کے ساتھ سرحدوں پر ہو رہی ہے ان لوگوں کو محمد جعفر نمبر دار تھانیسری روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے تین بجے رات کے سپرنٹنڈنٹ پولس معہ وارنٹ خانہ تلاشی کے میرے دروازے پر موجود ہیں۔انہوں نے اوّل وارنٹ دکھایا بعدہ کہا کہ گھر کی تلاشی دو اس وقت میں سمجھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔بیٹھک کی تلاشی ہونے لگی اور وہی خط جس کا ڈر تھا سب سے پہلے پولس کے ہاتھ لگا۔''
>
> (مولانا جعفر تھانیسری، تواریخِ عجیب ص:۱۷۷)

مولانا نے اپنی تصنیف میں اس واقعے کے بعد کی ذہنی وجسمانی زیادتیوں کی طویل تفصیل بتائی ہے اس کے علاوہ جیل کے دیگر رفقا کا ذکر بھی مزہ لے لے کر کیا ہے۔اس کتاب میں برطانوی حکومت کا جبر و استبداد، پھانسی کی سزا پانے پھر اس سزا کو عمر قید میں تبدیل ہو جانے، انڈومان جزیرے میں فرقہ وارانہ فساد پھیلنے اور ہندو مسلم اتحاد و تفریق کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔مولانا نے تواریخ عجیب میں اپنی نفسیاتی کمزوری اور استقامت دونوں کا تذکرہ کیا ہے۔اپنی زندگی کے بارے میں جن باتوں کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ان میں اپنی ازدواج کے متعلّق بھی پر لطف باتیں کی ہیں مولانا جب گرفتار ہوئے تو شادی شدہ اور صاحبِ اولاد تھے لیکن انڈومان میں انہوں نے مزید دو شادیاں کیں۔ان میں سے ایک شادی سے متعلّق جو تفصیل مولانا نے بتائی ہے اس کا اقتباس دل چسپی سے خالی نہیں۔

> ''ٹاپو بد عورتوں سے بھرا ہوا تھا اور میں اس ٹاپو میں افسر تھا بہت سی عورتوں نے مجھے اپنا شکار کرنا چاہا میں نے کیفیت دیکھ کر اپنی بیوی کو پانی پت سے بلانا چاہا مگر اس وقت وہ راضی نہ ہوئی جب ایک دفعہ اس کی

کچھ رضا مندی بھی ہوئی تو میری درخواست حاکمِ وقت نے نامنظور کر دی اس واسطے مجبوراً کسی نیک عورت سے وہیں عقد کرنے کی صلاح ٹھہری۔ ایک ہندو عورت قوم برہمن ضلع الموڑہ کی رہنے والی نئی قید ہو کر وہاں پہنچی اور بارک عورات ہندو میں میرے حوالہ ہوئی حاکمِ وقت سے اطلاع کر کے ۱۵/اپریل ۱۸۷۰ء کو اس سے نکاح کر لیا۔ اس بیوی سے مجھ کو دس بچے پیدا ہوئے۔ اور یہی پورٹ بلیر سے میرے ساتھ ہندوستان آئی۔''

(مولانا جعفری تھانیسری تواریخِ عجیب ص:۱۹۷)

مولانا جعفری تھانیسری کی یہ تصنیف چھوٹے سائز کی کھلی کتاب میں ڈیڑھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے مولانا مذکورہ احوال کے علاوہ وہاں انگریزی سیکھنے، اس میں مہارت حاصل کرنے، مختلف چالیس نسلوں اور قوموں کی آبادی والے انڈومان جزیرے کے بارے میں بہت ساری خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کی مقامی زبان اور مشترکہ ہندوستانی زبان کا بھی ذکر کیا ہے۔

﴿۳﴾ **ظہیر دہلوی:** ظہیر دہلوی کی حیثیت خودنوشت سوانح نگاروں میں اس لئے مانوس ہے کہ انھوں نے اپنی خودنوشت میں ۱۸۵۷ء کے غدر کا بالتفصیل ذکر کیا ہے جو انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی آزادی کی پہلی جدّ وجہد تھی۔ ظہیر دہلوی کی یہ خودنوشت ۱۹۱۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی لیکن اس کی سنہ تصنیف ۱۸۵۷ء ہے۔ اس خودنوشت سوانح عمری کا مسودہ ظہیر دہلوی کے نواسے میر اشتیاق شوقؔ کے پاس تھا۔ اس کتاب سے متعلّق پبلشر کا بیان ہے کہ غدر کے حالات و واقعات معلوم کرنے کی تگ ودَو میں مسودے کا سراغ لگا اور یوں یہ معروف خودنوشت عالمِ وجود میں آئی۔ اس کتاب کی زبان فارسی آمیز ہے تاہم عبارت اور واقعات کو سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔ ظہیر نے غدر سے متعلّق سُنی سُنائی بات پر یقین نہیں کیا ہے بلکہ کتاب میں ان کا اپنا مشاہدہ و تجربہ بولتا ہے۔ ظہیر دہلوی کی آپ بیتی مکمّل و مفصّل کتاب نہیں لیکن خودنوشت سوانح لکھنے کے لیے جیسی ذہانت و استعداد کی ضرورت ہوتی ہے ویسا دل و دماغ ظہیر دہلوی کو حاصل تھا۔

ظہیر دہلوی کی خودنوشت میں ان کی ذاتی زندگی بچپن، لڑکپن، جوانی، ہر دَور کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے وقت ظہیر کی عمر صرف ۲۲ رسال تھی اس نَوعمری میں بھی انھوں نے مجلسی روابط، سماجی احوال اور دہلوی معاشرت کا بڑی چابک دستی سے نقشہ کھینچا ہے۔ ان کی کتاب میں ان جزئیات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے حادثات اور ظہیر کی زندگی کے تجربات آپس میں مل کر اس طرح تاثر پیدا کرتے ہیں کہ پڑھنے والا لا مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے ذریعے غدر کے اَلَم انگیز واقعہ پر تو روشنی پڑتی ہی ہے۔ مصنّف کی سرگزشت اور غمناک داستان بھی قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ ظہیر نے طالبِ علمی کے زمانے کے واقعات مثلاً چار سال کی عمر میں روزہ رکھنا، لکھنا پڑھنا سیکھنا، قراتِ قرآن مجید، پندنامہ، گلستاں و بوستاں اور دوسری کتابوں کی تحصیل کے زمانے کا اور بارہ سال کی عمر میں ان سب تعلیم سے فراغت کا دلچسپ بیان اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ ظہیر دہلوی کی خودنوشت میں دہلی خصوصاً شاہ جہاں آباد کی گلی کوچوں کی رنگارنگی اس کی محفلوں اور مشاعروں کا خوب ذکر ملتا ہے۔ ظہیر نے غالبؔ، آزردہؔ، عیشؔ، وحشتؔ اور داغؔ کے ادبی جلسوں اور محفلوں کا مزے لے لے کر ذکر کیا ہے۔ یہی نہیں غدر کے بعد ان محفلوں کے درہم برہم ہونے کا غمناک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ دِلّی والوں کی سماجی زندگی مثلاً پھول والوں کی سَیر،

مشاعروں کے انوکھے اور دل چسپ طریقے، داد و تحسین دینے کے نرالے انداز سب کا ذکر داستان غدر میں بڑی حُسن کاری سے کیا ہے۔ بقول صبیحہ انور:

''داستانِ غدر میں جیسا کہ اس کتاب کا عنوان ہے غدر کے قیامت خیز واقعات بڑی جاں سوزی کے ساتھ بیان کئے ہیں ہندوستان کی تاریخ کا یہ واقعہ ظہیر دہلوی کی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اسی کے باعث ظہیر کو دہلی چھوڑنا پڑی اور گردشِ روزگار کا شکار ہوئے جگہ جگہ در بدر کو چہ بہ کو چہ ہر ملک اور ہر خطہ کی خاک چھاننی پڑی چناں چہ اپنے متعلق ایک شعر لکھا ہے۔ جس سے ان کی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

چہ پرسی از سرو سامانیم عمر بست چوں کاکل
سیہ بختم، پریشان روزگارم خانہ بردوشم

انگریزوں کی ذہنی کیفیت کا بہت باریکی سے مشاہدہ کیا ہے۔ ان کی ذہنی کیفیات کی بہت خوب صورت تصویر کشی کی ہے۔ ظہیر دہلوی نے اس زمانے کے مختلف علما، حکما اور سماج کے دوسرے افراد کی نفسیات کا تجزیہ بہت بہتر انداز میں کیا ہے۔ ایک شکی انگریز افسر جس کے دماغ پر ہر وقت بغاوت ہی بغاوت سوار رہتا اور ہر ہندوستانی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اس کی ذہنی کیفیت بیان کرتے ہوئے ایک معروف ہاتھی مولا بخش کے متعلق اس کے جملے کا حوالہ دیا ہے۔ ''یہ ہاتھی باغی ہے اسے نیلام کردو''

(ظہیر دہلوی داستان غدر، ص: ۲۵)

ظہیر دہلوی نے اپنی خود نوشت میں جگہ جگہ انگریزوں کے ظلم و ستم اور زیادتی و سیاہ کاری ذکر کیا ہے۔ مختلف طریقے سے دلّی والوں کو تنگ کرنا، گھر لوٹنا اور الزام تراشی کرنا ان کی عادت سی بن گئی تھی۔ ظہیر نے شہر کی صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے انگریزوں کی مکّاری کی تصویر کشی کچھ یوں بیان کیا ہے:

''شہر کی یہ کیفیت تھی کہ بدمعاش شہر کو پوربیوں کو ہمراہ لئے ہوئے بھلے مانسوں کے گھر لٹواتے پھرتے تھے اور جس کو مال دار دیکھا ان کے گھر پوربیوں کو لے جا کر کھڑا کر دیا کہ یہاں میم چھپی ہوئی ہے۔''

(ظہیر دہلوی دادتان غدر صفحہ: ۳۷)

''ظہیر دہلوی کا یہ فقرہ کہ یہاں 'میم' چھپی ہوئی ہے۔ صرف ایک جملہ نہیں بلکہ انگریروں کی ظلم و زیادتی اور سینہ زوری کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ظہیر دہلوی نے اپنی خود نوشت کا نام، آپ بیتی رکھا تھا جس میں سنہ ۱۸۵۷ء کے عذر کی پوری تفصیل بیان کی گئی تھی اس لئے پبلیشر نے اس کا مختصر نام ''داستانِ غدر'' رکھا۔ داستانِ عذر کے سرِ ورق پر لکھا ہوا جملہ اس کی وضاحت کرتا ہے۔ ''داستانِ غدر یا طراز

ظہیری یعنی حضرت راقم الدولہ ظہیر دہلوی شاگرد رشید حضرت ذوق علیہ الرحمہ کے چشم دید حالات عذر اور اپنی سوانح عمری۔''

(سرورق، داستان غدر، مطبع کریمی دہلی)

﴿۴﴾ **مولانا ابوالکلام آزاد:** مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت تذکرہ کے نام سے ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی یہ اس وقت کی تحریر ہے جب مولانا ابولکلام آزاد کی عمر تیس سال کے آس پاس تھی۔ مولانا نے اپنی نامکمّل خودنوشت سوانح حیات ''تذکرہ'' کے نام سے اُس وقت لکھی جب اردو میں یہ صنف خال خال تھی تذکرہ کے شائع ہونے میں فضل الدین احمد مرزا کی مثبت تگ ودَو کا زیادہ حصّہ ہے کہ انھوں نے مولانا سے اصرار کرکے ان کے حالاتِ زندگی قلم بند کرائی اور اسے کسی قدر اپنے مفصّل مقدمے کے ساتھ ۱۹۱۹ء میں شائع کیا۔ فضل الدین احمد نے مولانا ابوالکلام آزاد سے متعدد بار اصرار کیا کہ وہ اپنے حالاتِ زندگی قلم بند کریں لیکن مولانا نے ان کی بات کو کبھی مذاق میں ٹالا تو کبھی یہ کہہ کر صاف انکار کردیا کہ:

''کتنی بزرگ اور عظیم الشان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں جن کے سوانح حالات نہیں لکھے گئے ان کو چھوڑ کر میری زندگی کے حالات مرتّب کرنا ایک تمسخر انگیز حرکت ہوگی۔''

(مولانا آزاد تذکرہ، ص۱۴)

مولانا آزاد کی خودنوشت سوانح اس زمانے کی تحریر ہے جب ان کی علمیت اور قابلیت کا پورا ملک اعتراف کرچکا تھا۔ ان کی طرزِ تحریر کا سکّہ ادبی حلقوں میں بیٹھ چکا تھا۔ چناں چہ ان کی طرزِ تحریر کی یہ خوبی خودنوشت سوانح میں بھی جھلکتی ہے۔ مولانا نے اپنی خودنوشت سوانح کے زیادہ تر صفحات کو علما کے تذکرے میں صرف کیا ہے۔ اپنے خاندانی اوصاف بتائے ہیں۔ اپنے اسلاف، اربابِ صدق وصفا اور ان کے تصوّرِ حیات کی تفصیل بتائی ہے۔ مولانا نے اپنی ذات کا تذکرہ کیا تو ہے لیکن اسے استعارات کنایات کے پیرائے میں اور شاعرانہ اسلوب میں اس خوب صورتی کے ساتھ کہ پڑھنے والے ان کی ذات سے زیادہ ان کی طرزِ تحریر میں کھوجائیں۔ خودنوشت کے ناشر فضل الدین احمد مرزا ان کے خاندانی وراثت واحوال سے زیادہ مولانا کے ذاتی زندگی کے متعلّق لکھوانا چاہتے تھے۔ مولانا نے لکھا بھی لیکن مرصّع ومقفّع اور تشبیہات و استعارات کے پیرائے میں اسی شاعرانہ استعارے میں انھوں نے اپنی پیدائش کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:

''غریب الدّیار ونا آشنائے عصر بیگانہ خویش نمک پروردہ ریش، معمورہ تمنا وخرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد مدعو یابی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ ہستی عدم سے اس ہستیِ عدم نما میں وارد ہوا والد مرحوم نے تاریخی نام فیروز بخت رکھا تھا اور مصرعہ ذیل سے ہجری سال استخراج کیا تھا۔ جواں بخت جواں طالع جواں باد۔ آبائی وطن دہلی مرحوم ہے مگر مادری وطن سرزمین مطہر طیبہ ودار الہجرت سید الکونین وشہرستان بنوت و وحی ہے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد، تذکرہ، ص۲۹۸)

مولانا آزاد نے اپنی خودنوشت میں اپنی ذات سے متعلّق اسی طرح کی تحریر کا استعمال کیا ہے۔ بعض جگہوں پر شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس زمانے کے حالات کو اس قدر پیچ در پیچ بیان کیا ہے کہ قاری کا ذہن ان کی تحریری بھول بھلیّوں میں کھو جاتا ہے۔ اپنی کتاب مولانا آزاد فکر و فن میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جب ہم مولانا کے تذکرے کا بحیثیتِ خودنوشت سوانح حیات کے جائزہ لیتے ہیں تو ابتدائی حصّہ میں شیخ جمال الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے اس عہد کے پیچ در پیچ واقعات کا سلسلہ اس قدر طویل کر دیا ہے کہ خود شیخ موصوف کی شخصیت دَب کر رہ گئی اور تھوڑی دور آگے چل کر قاری یہ بالکل فراموش کر دیتا کہ آخر اس سرگزشت کا مرکزی کردار اور بنیادی موضوع کون سی ذات یا کون سی بات تھی''

(ملک زادہ منظور احمد۔مولانا آزاد فکر و فن، ص ۲۸۷)

مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت تذکرہ ادبی لحاظ سے اس صنف میں ایک خاطر خواہ اضافہ ہے۔ ان کی تحریر میں جذبات کی شدّت، شاعرانہ رموز و علائم اور الفاظ کا برمحل استعمال قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں لیکن خودنوشت سوانح کی صنفی قدروں سے میل نہیں کھاتا کیوں کہ خودنوشت یا آپ بیتی میں اس شخص اور اس کے عہد کے حقائق کی عکاسی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت میں حقائق ان کی طرزِ تحریر اور شاعرانہ اندازِ بیان میں چھپ گئے ہیں جن کی وجہ سے ان کے عہد کے واقعات کی تفصیل پر کم روشنی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کی داستانِ حیات کے مختلف گوشوں کی تلاش کرنے کے لئے دیگر تصانیف کی ضرورت پڑتی ہے۔ حالاں کہ خودنوشت سوانح سے مصنّف کے حالاتِ زندگی کا خاطر خواہ اندازہ ہو جانا چاہئے۔ مولانا آزاد کی خودنوشت ''تذکرہ'' قاری کو ان کی منفرد طرزِ تحریر سے متعارف تو کراتا ہے لیکن ان کے عہد کی صحیح صحیح نشان دہی نہیں کراتا۔

﴿۵﴾ **سرسید رضا علی:** ۱۹۱۹ء کی دو معروف خودنوشتوں خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تذکرہ کے دو دہائی کے بعد ملکی اور عالمی غیریقینی صورتِ حال کے درمیان سر رضا علی کی خودنوشت ''اعمال نامہ'' ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ خودنوشت کی صنفی معیار پر پوری اُترنے والی باضابطہ طور پر یہ پہلی تصنیف ہے۔ اپنی خودنوشت میں سرسید رضا علی نے صنف خودنوشت نگاری کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھا ہے۔ چونکہ مصنّف انگریزی زبان و ادب سے خاصا واقفیت رکھتے تھے اس لیے انگریزی کی خودنوشتوں کا بغور مطالعہ کیا تھا اور صنفی وہیئتی اعتبار سے اپنی تصنیف میں ان قواعد و ضوابط کو بھی رَوا رکھا۔ فن خودنوشت نگاری کے اصولوں کو پوری طرح پیشِ نظر رکھتے ہوئے سرسید رضا علی نے اپنی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر و رجحانات کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ خودنوشت قدرے بڑے سائز کی ۵۲۷ رصفحات پر ۱۶ رابواب میں منقسم ہے جس میں ۳۰۰ سے زیادہ ذیلی عنوانات بھی دیے گئے ہیں اس کتاب کی پہلی طباعت دسمبر ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف ہندوستان میں Quit India Movement بھارت چھوڑ و تحریک زوروں پر تھی تو دوسری طرف عالمی جنگ (دوم) اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ سر رضا علی نے اپنی خونوشت میں ان حالات کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

مصنّف نے اس خودنوشت (اعمال نامہ) کے دوسرے حصّے کا مسودہ بھی تیار کرلیا تھا لیکن ناگفتہ بہ مسائل اور موت کے فرشتے نے اس کے دوسرے حصّے کی تکمیل کی اجازت نہ دی۔ کچھ ایسے اشارے ملتے ہیں کہ دوسرے حصّے میں مصنّف کے ذاتی اور دِلی معاملات کا تذکرہ زیادہ ہی تھا۔ سر رضا علی نے اپنی خودنوشت ''اعمال نامہ'' کی تصنیف کے محرکات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اُردو میں آپ بیتی لکھنے کا رواج نہیں ہے جو انگریزی داں حضرات سیاسی چسکہ کے باعث اپنے حالات لکھتے ہیں وہ انگریزی میں خامہ فرسائی کرتے ہیں اور جن نامور انگریزوں نے اپنے حالاتِ خود اپنے قلم سے لکھے ہیں ان کتابوں کو اپنے لئے بہترین نمونہ سمجھتے ہیں پہلے میرا بھی مقصد تھا کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھوں اور اگر میرا مقصد صرف سیاسی دریا میں غوطہ لگانا ہوتا تو غالبًا اپنے خیالات انگریزی میں ہی قلم بند کرتا مگر غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ملکی زندگی کا دائرہ سیاست کے حلقے سے کہیں زیادہ وسیع ہے جزو ہمیشہ کل میں داخل اور شامل ہوتا ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اپنے زمانے کی ملکی زندگی کی تصویر اپنے اہلِ ملک کی خدمت میں پیش کروں سیاسی مسائل کے نقش و نگار آپ ہی اس میں آجائیں گے۔ اردو کو میں نے انگریزی پر اس لئے ترجیح دی ہے کہ ہر قوم کی تہذیب و شائستگی اور اس قوم کی زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ملکی رسم و رواج، معاشی حالات، ادبی نکات، مذہبی مسائل، حُسن و عشق کی کشمکش، نامرادوں کی تمنّاؤں، بے پڑھوں لکھوں کی بے زبان آرزوئں، مفلسوں اور ناداروں کے خاموش آنسوؤں کا بیان اُردو میں ہی ہوسکتا ہے جو ملک کی سب سے بڑی سب سے جامع اور سب سے زوردار زبان ہے.........انگریزی میں ان سب باتوں کا لکھنا انمول، بے جوڑ اور بے سود ہوتا۔''
>
> (سر رضا علی، اعمال نامہ ص:۹۴،۳۹۳)

سر رضا علی پیشہ سے وکیل اور سیاست داں تھے اور اُردو ادب کا صاف ستھرا مذاق رکھتے تھے لیکن انہوں نے اُردو میں اپنی آپ بیتی ''اعمال نامہ'' کے سوا کچھ بھی نہیں لکھا۔ ''اعمال نامہ'' اس وقت کی تحریر ہے جب مصنّف کی زندگی کی شام ہو چلی تھی یعنی ۶۳ رسال کی عمر میں ماضی بعید کے واقعات و حالات کے اثرات ان پر اس قدر حاوی تھے کہ ماضی قریب اور زمانۂ حال کی طرف اپنی آپ بیتی میں کم توجہ کی ہے۔ خود نوشت سوانح میں سر رضا علی نے جو بحثیں کی ہیں ان سے ان کے وسیع مطالعے اور مشاہدے کا عندیہ ملتا ہے سر رضا علی کو اردو ادب کا ہی نہیں بلکہ انگریری زبان و ادب کا بھی گہرا شعور تھا اعمال نامہ میں یہ حقیقت جا بجا اپنا گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ سر رضا علی کی ازدواجی زندگی میں کافی اُتار چڑھاؤ رہا۔ اعمال نامہ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ان کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی زیادہ خوش گوار اور کامیاب ثابت نہ ہوسکی۔ حالاں کہ سر رضا علی نے اپنی پہلی بیگم کی بعض جگہوں پر تعریف کی ہے۔ مگر وہ دل چسپی سے خالی ہے۔ سر رضا علی کا نکاح صرف ۱۸ سال کی عمر میں ہوا اور رخصتی بیس سال کی عمر میں جبکہ ان کی دوسری شادی پہلی بیوی کے انتقال کے ۳ رسال کے بعد ۵۶ رسال کی عمر میں ہوئی۔ سر رضا علی نے دوسری بیوی سے جنون کی حد تک محبت کی۔ انہوں نے لیڈی رضا علی کا تذکرہ بڑی گرم جوشی سے اور بار بار اپنی خودنوشت میں کیا ہے بلکہ لیڈی رضا علی مرحومہ کے لیے کتاب میں ایک پورا ذیلی عنوان قائم کیا ہے۔ اس ذیلی عنوان کے تحت ۱۹۳۵ء میں جنوبی افریقہ کا دوسری بار سفر میں پونو ویلو سامی (لیڈی رضا علی) سے ملاقات، شادی کا ارادہ ان سے عشق جنوبی افریقہ میں قیام وغیرہ کا مزے لے لے کر تذکرہ کیا گیا ہے۔

سر رضا علی کی خودنوشت اعمال نامہ میں خودنوشت کی صنفی وفنّی عناصر اور ضابطوں کو برتنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے لیکن بعض مقامات پر تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ سر رضا علی نے اپنے بعض ہم عصروں اور معروف شخصیتوں کا تذکرہ یا تو کیا ہی نہیں ہے یا پھر سرسری طور پر ایک دو جملے لکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے ہیں مثلاً معروف ومشہور نقاد امداد امام اثر اور مشہور شاعر شاد عظیم آبادی جیسی شخصیتوں کو ''اعمال نامہ'' میں خاطر خواہ جگہ نہ مل سکی جبکہ مصنف کا دعویٰ یہ کہ:

> ''میرے نزدیک اپنے لکھے ہوئے سوانح حیات کی سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہئے کہ ایک مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آ کر با آواز بلند پڑھ لیں تو لکھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے۔''

سر سید رضا علی نے اپنے اعمال نامہ کی عظیم الشّان عمارت کی تعمیر میں اپنے پاس محفوظ بہت سی یادداشتیں، روزنامچے اور خطوط کا استعمال کیا ہے۔ مصنّف کو غالباً اس بات کا احساس تھا کہ آگے چل کر یہ چیزیں خودنوشت کی تصنیف میں کار آمد ثابت ہوں گی۔ چند عبوری خامیوں کو اور انسانی لغزشوں کو اگر درگزر کر دیا جائے تو اعمال نامہ کو بہترین خودنوشتوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

04.04 آزادی کے بعد کے اہم خودنوشت سوانح نگار

ملک کی آزادی کے فوراً بعد کئی خودنوشت سوانح عمریاں سامنے آئیں جن میں نواب سعید حسن خان چھتاری کی ضخیم خودنوشت ''یادِ ایّام'' دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ کم وبیش مولانا حُسین احمد کی خودنوشت ''نقشِ حیات'' ان ہی دنوں منظر عام پر آئی۔ آزادی کے بعد شائع ہونے والی خودنوشتوں میں ظفر احمد ایبک کی ''آپ بیتی'' بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ دیوان سنگھ مفتون کی ''نا قابلِ فراموش''، عبد الغفار مدھولی کی ''ایک طالب علم کی کہانی''، ہوش بلگرامی کی ''مشاہدات''، عبدالمجید سالک کی ''سرگزشت''، چودھری خلیق الزّماں کی ''شاہراہِ پاکستان''، شورش کاشمیری کی ''بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل''، کلیم الدین احمد کی ''اپنی تلاش میں''، گوپال متل کی خودنوشت ''لاہور کا جو ذکر کیا''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری''، عتیق احمد صدیقی کی ''یادوں کے سائے''، احسان دانش کی ''جہانِ دانش''، ہمایوں مرزا کی ''میری کہانی میری زبانی''، مرزا ادیب کی خودنوشت ''مٹی کا دِیا''، عبدالماجد دریا آبادی کی ''آپ بیتی''، قرّۃ العین حیدر کی ''کارِ جہاں دراز ہے''، کنور مہندر سنگھ بیدی کی ''یادوں کا جشن''، وزیر آغا کی ''شام کی منڈیر سے''، کشور ناہید کی ''بری عورت کی کتھا'' اور معروف شاعر اختر الایمان کی خودنوشت سوانح حیات ''اس آباد خرابے میں'' بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن آزادی کے بعد جن معروف خودنوشت سوانح نگاروں نے خود نوشت کی صنف میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ ان میں شادؔ عظیم آبادی، یوسف حُسین خاں، جوشؔ ملیح آبادی، خواجہ غلام السیدین اور مشتاق احمد یوسفی کی خودنوشت سوانح عمریاں بہت ہی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس اکائی میں اختصار وطوالت کا لحاظ رکھتے ہوئے ان میں سے صرف تین خودنوشت سوانح نگاروں کا قدرے تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

﴿۱﴾ **شادؔ عظیم آبادی:** اُردو خودنوشت کی تاریخ میں شادؔ عظیم آبادی ایسے خودنوشت نگار ہیں جنھوں نے اپنی خودنوشت لکھی لیکن وہ دوسرے کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ عجیب وغریب بات ہے کہ کوئی شخص اپنی آپ بیتی لکھے اور اس بات کی وصیّت کر جائے کہ میرے مرنے کے بعد اس خودنوشت کو کسی دوسرے شخص کے نام سے شائع کیا جائے۔ شادؔ عظیم آبادی نے اپنی خود نوشت ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' کا مسودہ خود تیار کیا لیکن اسے اپنے نام سے شائع نہیں کرانا چاہتے تھے، اس سے قبل بھی شادؔ نے اپنی آپ

بیتی کے کئی مسودے مرتب کیے لیکن شائع نہیں کرا سکے اور بار بار اسے قلم زَد کر دیا۔ یہ آخری مسودہ شاؔد نے اپنے لائق شاگرد مسلؔم عظیم آبادی کے سپرد کر دیا۔ مسلم عظیم آبادی کا بیان ہے کہ استاد نے اسے میری طرف سے صیغۂ غائب میں رکھا تھا میں اسے اپنی طرف منسوب کر کے شائع کرانا دیانت داری نہیں سمجھتا تھا۔

اس خودنوشت کے متعلق ان کی رائے ہے کہ:

''اپنے اور استاد کے مطمحِ نظر کے اسی اختلاف سے میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ یہ سوانح جیسے چاہئے استاد کی زندگی میں نہیں شائع ہوسکتی، میں اس سے ہاتھ دھو کر بیٹھ گیا۔ آخر ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ سید صاحب نے مبسوط سوانح حیات میری طرف سے صیغۂ غائب میں لکھ کر اس کا نام ''کمال عمر'' رکھا اور یہ غیر صاف شدہ مسودہ سیکڑوں صفحوں پر محیط کر کے میرے حوالے کر دیا۔ مجھے بڑا سکون اور اطمینان ہوا کہ ایک مشکل حل ہو گئی۔ اپنے قلم سے حیاتِ شاد میں واقعات، تبصرہ، تنقید میں کوئی اونچ نیچ، پاس داری یا صاف گوئی کا الزام میرے سر نہ رہے گا۔ بڑا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اس کتاب کا نام استاد نے ''کمالِ عمر'' رکھا تھا مجھے اس کتاب میں اصل موضوع کی طرف انتقالِ ذہن کی صفت نظر نہ آئی اسی لئے میں نے ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' کے نام سے موسوم کیا۔''

(شاد کی کہانی شاد کی زبانی، ص:۴-۵، بحوالہ ڈاکٹر صبیحہ انور، اُردو میں خودنوشت سوانح نگاری، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص:۲۴۶)

اس راز سے متعلق نہ تو شاؔد عظیم آبادی نے کسی ہم عصر کو کچھ بتایا اور نہ ان کے شاگرد نے اس کے پوشیدہ رکھنے کا سبب بیان کیا۔ شاؔد عظیم آبادی کی خودنوشت میں عام خودنوشتوں کی طرح ہی خاندانی احوال، اصولِ تعلیم، طعام و قیام، شاعری کی خوبیاں، مالی پریشانیوں کا شکوہ یہ سب ہے پھر وہ کون سی بات تھی جس سے پریشان ہو کر اپنی آپ بیتی اپنی زندگی میں اپنے نام سے شائع نہیں کرانا چاہتے تھے۔ بعض محققین و ناقدین نے دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک تو انھیں اپنی ادبی عظمت کا بے پناہ احساس تھا اور دوسرے ان کے ہم عصر کی شدید مخالفت جس کے متعلق شاؔد عظیم آبادی نے اپنی خودنوشت میں ایک طویل وضاحت پیش کی ہے۔ نقاد اسی وضاحت کو ان کی خودنوشت کا اہم حصہ مانتے ہیں۔ ان دونوں باتوں یعنی شاؔد کی اپنی عظمت کا خود اعتراف اور ان کے خلاف ادبی محاذ کا قائم ہونا مذکورہ حقیقت کو ثابت کرتا ہے کیوں کہ خودنوشت میں کچھ باتیں ایسی تو ضرور ہیں جس کی ''پردہ داری'' شاد چاہتے تھے۔ شاد کی خودنوشت کا سب سے اچھا مسودہ ان کے ایک اور شاگرد پیارے لال شاکر میرٹھی شائع کرانے کی غرض سے لے گئے لیکن اتفاقاً شاد کی زندگی میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ شاد کی خودنوشت میں ان پر خودستائی کا الزام لگ جاتا کیوں کہ شاد نے اپنی تعریف میں کئی سفید صفحے سیاہ کر رکھے ہیں جو خودنوشت کے اصول وضوابط سے میل نہیں کھاتے۔ شاد کی ان باتوں کو کوئی نیم تعلیم یافتہ یا ان کا گرویدہ تو قبول کر سکتا ہے لیکن ادبی محقق اور انسانی نفسیات کا ماہر ہرگز نہیں۔ مثلاً شاد کا یہ بیان جو شاگرد کی طرف سے منسوب ہے کہ سات برس کی عمر میں سید صاحب فارسی کا اردو میں ترجمہ کرنے لگے یا پھر یہ کہ فارسی کے محاورے اور بات چیت میں سید صاحب کو نو دس برس میں اتنا ملکہ ہوگیا تھا کہ بعض ناواقف اہل عجم گھبرا کر کہہ اُٹھتے تھے کہ بچہ از اصفہان است۔ شاد نے عام طور سے چند

لوگوں کے سوا دوسروں کو گنوار اور دہقانی سمجھا، اردو ہندی کے قضیہ نے بھی شاد کے خلاف محاذ آرائی میں مدد کی۔ شاد کو ان کی زندگی میں رُسوا کیا جاتا رہا۔ انھوں نے اپنی خودنوشت میں اپنی مخالفت کے سلسلے کو بارہ سال سے پچاس سال تک بتایا ہے۔ شاد کو اس مخالفت اور بے بسی کا اس قدر احساس تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی سکون سے نہیں بیٹھے۔

مسلم عظیم آبادی نے شاد کی کہانی شاد کی زبانی کے تتمہ میں اس کا ذکر یوں کیا ہے:

''مولانا شاد کی شاعرانہ زندگی کا آغاز مخالفتوں سے ہوتا ہے ان کے کئی اسباب تھے کچھ تو آپ کا تفاخر وتعلّی خواہ وہ حقیقت پر مبنی ہو۔ درحقیقت وہ عام شعرا کی سطح سے اتنے بلند تھے کہ ان کی تعلّی وتفاخر نازیبا نہ تھی۔ کچھ معاصرین کا رشک وحسد مگر فوری سبب ان کی کتاب ''نوائے وطن'' تھا۔''

(شاد کی کہانی شاد کی زبانی، ص:۲۶۲)

شاد نے اپنی خودنوشت میں کم وبیش ایک سو صفحات میں بچپن، جوانی، خاندان اور مخالفت کا ذکر کیا ہے اور تقریباً ڈیڑھ سو صفحات میں اپنی علمی برتری اور شاعرانہ عظمت اور خوبیاں بیان کی ہے، ناقدری کا شکوہ کیا ہے، معترضین کے لئے جواب لکھا ہے اور اپنی شاعری کی تفصیل لکھی ہے۔ گویا شاد کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کے پایہ کا ان کے ہم عصروں میں کوئی نہیں۔ شاد نے اپنی وفات سے تقریباً پانچ سال قبل ۱۹۲۱ء میں اپنی خودنوشت کا مسودہ تیار کرلیا تھا لیکن ان کی یہ تصنیف ان کی وفات کے ۳۶ رسال بعد ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی اور وہ بھی ڈاکٹر ذاکر حسین کی کوششوں سے جو اس وقت بہار کے گورنر تھے۔

﴿۲﴾ **یوسف حسین خاں:** یوسف حسین خاں دراصل تنقید، تاریخ اور ادب بالخصوص صنفِ غزل اور اقبالیات کے مرد میداں ہیں لیکن انھوں نے ''یادوں کی دنیا'' جیسی خودنوشت تحریر کر کے خودنوشت سوانح حیات کی صنف میں بھی اپنا لوہا منوالیا ہے۔ یوسف حسین خاں معروف ومشہور مصنّف اور سابق صدرِ جمہوریۂ ہند نیز جامعہ کے بنیاد گزاروں میں سے ایک ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی ہیں۔ یوسف حسین خاں واحد خودنوشت سوانح نگار ہیں جنہوں نے اپنی خودنوشت کی تحریر میں بہتر منصوبہ بندی سے کام لیا ہے۔ یوسف حسین خاں کی خودنوشت ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آئی۔ مصنف نے اپنی خودنوشت میں مختلف شخصیات، کردار، تحریکات ورجحانات کے ساتھ ساتھ تاریخ وتہذیب کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ مصنّف نے اپنی تصنیف میں اپنے عہد، اپنے خاندانی حالات وغیرہ کی تفصیل کے علاوہ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، جوشؔ ملیح آبادی، فانیؔ بدایونی، جگرؔ مرادآبادی، عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد علی جوہر اور سروجنی نائیڈو جیسی علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ یوسف حسین کی خودنوشت کے مطالعے سے ان کی شخصیت کے جو پہلو نمایاں ہوتے ہیں وہ ایک نیک سیرت ادیب اور مؤرّخ کی ہے۔ ان کی زبان پر مغربی اتر پردیش کے لہجے کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ مصنف کے جذبے، اسلوبِ نگارش اور دل نشیں اندازِ بیان قاری کو ان کی خودنوشت کی طرف بار بار متوجہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں خودنوشت سوانح نگار کے ساتھ ساتھ ایک مؤرّخ بھی ہیں چناں چہ انھوں نے ''یادوں کی دنیا'' میں اپنے خاندانی اور نسلی امتیاز کا تذکرہ کرتے ہوئے مغل حکمرانوں کے سیاسی حالات سے اس کا آغاز کیا ہے۔ یادوں کی دنیا میں تاریخ وتہذیب، سیرت وشخصیت، حالات وواقعات اور افکار ونظریات کو اس سلیقے سے مصنّف نے پیش کیا ہے کہ قاری ان حقائق کے ساتھ ساتھ ایک خوش گوار ادبی

ماحول سے لطف اندوز ہوتا ہے چونکہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں بذات خودفن سوانح نگاری اور خودنوشت سوانح حیات کی فنی خوبیوں اورادبی لوازمات پر گہری نظر رکھتے ہیں اس لئے انھوں نے اپنی خودنوشت میں ان لوازمات کو برتا بھی ہے۔

''یادوں کی دنیا'' میں رقم طراز ہیں:

''آپ بیتی زندگی کی تاریخ بھی ہے، حافظے کو کھنگالنے سے جو تصویر سامنے آتی ہے اس میں ایک طرح کی طلسمی کیفیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے بشرطیکہ کہانی کہنے والا اپنے فن کے آداب برتنا جانتا ہو۔ خیالی نقوش جب صفحۂ قرطاس پر اُتارے جاتے ہیں تو جذبے کی رنگ آمیزی کسی نہ کسی صورت میں راہ پا جاتی ہے اور خیالی پیکروں میں ایسی تحلیل ہو جاتی ہے کہ ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا، بلاشبہ تخلیقی سیرت میں اس سے اضافہ ہوتا ہے تاہم ادیب کے ہاتھ سے صداقت اور حقیقت کا دامن کبھی نہیں چھوٹنا چاہئے۔''

(یوسف حسین خاں، یادوں کی دنیا،ص:ب، دیباچہ)

یوسف حسین خاں نے اپنے مورثِ اعلیٰ حسین خاں کے متعلّق بتایا ہے کہ وہ مغلوں کے دورِانحطاط میں ۱۵۷۱ء میں افغانستان سے ترک وطن کر کے ہندوستان پہنچے اور اتر پردیش کے قائم گنج میں مقیم ہوئے۔ اپنے والد فدا حسین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے تحصیل اسکول قائم گنج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد تجارت کی غرض سے حیدرآباد کا سفر کیا لیکن وہاں انھیں حصولِ علم کا دوبارہ شوق ہوا اور حیدرآباد سے انہوں نے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ فدا حسین نے آئینِ دکن کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا جو بہت ہی معروف ومقبول ہوا۔ یوسف حسین خاں نے اپنی خودنوشت میں اپنے سبھی سات بھائیوں کا ذکر کیا ہے لیکن اپنے ایک بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین کو ''فخر خاندان'' کے نام سے یاد کیا ہے اور ان کے لئے ایک پورا باب مختص کیا ہے۔ یوسف حسین نے اپنے والد اور بھائیوں کے ساتھ ساتھ اپنی والدہ ماجدہ نازنین بیگم کی سادگی، بردباری اور وضع داری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہماری والدہ کی طبیعت میں انتہائی سادگی و بردباری تھی۔ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتیں، اگر کوئی دوسرا ان کے سامنے کسی کی برائی کرتا تو خاموش ہو جاتی تھیں۔ وضع داری کا یہ عالم تھا کہ جس انداز سے ملتی تھیں اسے آخر تک قائم رکھا اس میں کبھی کوئی فرق نہ آنے دیا۔ ان کے متواضع اور ملنسار ہونے کا ذکر میں نے قائم گنج کی متعدد خواتین سے سنا جو انہیں اچھی طرح جانتی تھیں۔''

(یادوں کی دنیا،ص:۳۴)

یوسف حسین خاں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات کو تین مخصوص اَدوَار جامعہ ملیہ اسلامیہ، فرانس اور حیدرآباد میں منقسم کیا ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۹۲۶ء میں فرانس گئے جہاں سے انھوں نے ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ اپنی خودنوشت میں فرانس کے متعدد تحریکات، فرانسیسی زبان وادب اور تاریخی عمارتوں پر اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ وہاں کی خواتین کے حُسن کا بڑی خوب صورتی سے ذکر کیا ہے جن سے وہ بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔

انہوں نے لکھا ہے:

''میں نے ایسا باغ و بہار حُسنِ زندگی میں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ رنگ گورا، آنکھیں اور بال سیاہ، قد بوٹا سا، لڑکیاں اور بعض ادھیڑ عمر والیاں بھی رُخساروں پر غازہ اور ہونٹوں پر روز لگاتی ہیں جس سے اُن کا حُسن اور دوبالا ہو جاتا ہے۔''

(یادوں کی دنیا، ص.۱۰۸)

یوسف حسین خاں کی خودنوشت سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ وہ جنوری ۱۹۳۰ء میں فرانس سے ہندوستان واپس آئے اور مارچ ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ یہاں نہ صرف یوسف حسین کو ادبی شہرت و ناموری ملی بلکہ ملک گیر سطح پر انہیں علمی اور ادبی شہرت ملی۔ انہیں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے وابستگی کے دوران مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، وحیدالدین سلیم، مرزا محمد ہادی رسوا، محمد الیاس برنی، مولانا عبداللہ عمادی، سید ہاشمی فریدآبادی اور نظم طباطبائی جیسے نامور اُدبا و علما کی صحبت بھی میسر آئی۔

﴿۳﴾ **جوشؔ ملیح آبادی:** جوشؔ ملیح آبادی کی خودنوشت سوانح ''یادوں کی برات'' اردو خودنوشت سوانح نگاری کی تاریخ میں ممتاز و منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ نظم کی طرح ہی خودنوشت میں بھی جوش کا ''جوش'' نظر آتا ہے۔ وہی گھن گرج، وہی شان و شوکت، وہی اندازِ بیان اور وہی اسلوبِ تحریر نثر میں بھی نظر آتی ہے جن کا مشاہدہ ہم جوشؔ کی شاعری میں کرتے ہیں۔ جوش کی نثر نگاری کے ابتدائی نمونے ۱۹۲۰ء سے ملنے لگتے ہیں۔ جوشؔ کی طرزِ تحریر ان کے طرزِ فکر کی طرح ہی یک رنگی و یکسانیت سے عاری ہے۔ جوش نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی بارات'' کو قصداً صنائع و بدائع اور مقفّٰع و مسجّع عبارتوں سے سجانے کی کوشش کی ہے۔ یادوں کی بارات میں جو مسجّع و مقفّٰع زبان استعمال کی گئی ہے عہدِ حاضر کے شاید ہی کسی نثر نگار نے ایسی زبان کو سا ستعمال کیا ہو لیکن ان کی خودنوشت میں الفاظ کو جس خوب صورتی اور صنّاعی سے استعمال کیا گیا ہے اردو میں الفاظ کا موثر اور موزوں استعمال جدید اردو نثر میں شاید ہی نظر آتا ہے۔

تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل یہ خودنوشت سوانح عمری جوشؔ کے چھ سال کی علمی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ جوش کی خودنوشت کا اتنا چرچہ شاید نہ ہوتا اگر جوش ایک قادرالکلام شاعر نہ ہوتے۔ جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی خودنوشت میں 'خودکشائی' کے عنوان سے اپنی طبعی زندگی کے چار میلانات شعر گوئی، عشق بازی، علم طلبی اور انسان دوستی کی نشان دہی کی ہے جن سے ان کے احساسات و جذبات، خیالات و نظریات اور نفسیات و مشاہدات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی اور برسوں موضوع بحث رہی، کیوں کہ اس خودنوشت میں جوش نے اپنے خاندانی اور وراثتی جاہ و حشم کے بیان میں جس مبالغہ آرائی کا استعمال کیا ہے وہ ایک ترقّی پسند شاعر و ادیب کو شک کے دائرے میں لا کھڑا کرتا ہے۔ خودنوشت کے مطالعہ سے جوش کے بیانات میں کئی جگہ تضاد بھی پیدا ہوتا ہے۔ جوش کے ۱۸/معاشقوں کے ذکر سے اس بات کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ شاید جوش کے نزدیک عورت کی حیثیت صرف جنسی بھوک مٹانے کا ذریعہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جوش کی ترقّی پسندی محض فیشن ہے۔ یادوں کی برات میں کوٹھوں اور مجروں کی غیر ضروری تفصیل سے ان کے خواہ مخواہ واقعات کو طول دینے کی عادت کا پتہ چلتا ہے۔ جوش کی جاہ و حشمت، خاندانی امارت اور اشترا کی نظریات کے ڈھنڈورے کو سیاسی نعرہ بازی قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر وہاج الدین علوی لکھتے ہیں:

''جوش کی شاعری کا معتد بہ حصہ ترقی پسند نظریات کی تبلیغ وحمایت سے عبارت ہے اور جوش تمام عمر اس نظریے سے دست بردار بھی نہیں ہوئے۔ البتہ عمر کے آخری حصہ میں جب وہ اپنی خودنوشت لکھنے بیٹھے تو اپنے اجداد کے شاہانہ جاہ وجلال کا تذکرہ کرتے وقت غالبًا یہ بھول گئے کہ وہ جن بے اندازہ آسائشوں اور دنیوی لذّات کا ذکر کررہے ہیں وہ ایک ایسے عہد کی یادگار تھیں جوا کادکا افراد کی عشرتوں اور خرافاتی ذوق سے منسوب تھیں۔''

(ڈاکٹر وہاج الدین علوی، اردو خودنوشت: فن اور تجزیہ، ص:40-139)

جوش کی خودنوشت اوران کے اُسلوب تحریر سے متعلق مختلف النوع رائے پیش کی گئی ہیں۔ تقریباً ہر ناقد ومبصّر ان کے اُسلوبِ تحریر پر علاحدہ علاحدہ رائے رکھتا ہے۔ بعض نے ان کی خودنوشت کو لفّاظی، دروغ گوئی، مبالغہ آرائی، صنائع وبدائع کا غیر ضروری استعمال اور واقعات کا بے جا طول طویل کرنا بتایا ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اس خودنوشت کی بعض نثری خامیوں کو اگر دَرگزر کرکے دیکھا جائے تو یہ ایک دِل کش اور شوخ ودل چسپ فنّی مرقّع نظر آتا ہے۔ بعض مبصّرین اور جوش ملیح آبادی کے شیدائی ایسے بھی ہیں جو اس میں صوتی آہنگ اور معنوی حُسن تلاش کرتے ہیں۔ اس حلقہ کو ''یادوں کی برات'' اردو کی تمام خودنوشت سوانح عمریوں میں بے مثال نثری شاہکار نظر آتی ہے۔ درحقیقت جوش کی خودنوشت یادوں کی برات نہ تو پہلے سے طے شدہ ہیئت واسلوب میں لکھی گئی اور نہ کسی ایک لسانی فارمولے کے تحت۔ یادوں کی برات میں مختلف موسموں، علاقوں وغیرہ کی جو تصویر کشی کی گئی ہے اس سے جوش کی پسند وناپسند اور سختی وسستی کا پتہ چلتا ہے۔ موسم گرما جوش کو ناپسند تھا جب کہ موسم سرما اور موسم برسات جوش کو اتنے پسند تھے کہ ان کی تعریف میں کئی کئی صفحات سیاہ کئے اور اپنی قادرالکلامی، ذہانت اور شاعرانہ مصوّری کا نمونہ پیش کیا ہے۔ موسمِ برسات کی تصویر کشی کرتے ہوئے جوش نے لکھا ہے:

''او ہو جھومتی جھجھکتی جھر جھراتی، جھم جھماتی، جھم جھم برستی، جیون وادی جھومتی برسات، گھپ اندھیرا اور گھنگھور گھٹائیں۔ چھاؤں میں گھرتی، کھوتی گھر میں گھورائی لچکن ہوا، گرجتی گونجتی، گڑگڑاتی، گھنگھرو والی برکھا، آسمان کو گھماتی، زمین کو نچاتی، فضا کو چلاتی، شمس وقمر کو گہناتی، چوپائی کو تھپتھپاتی، طوفان پر طوفان اٹھاتی، زلفیں جھٹکاتی، کجریاں بناتی، کھیتیاں لہلہاتی، زمین کی پوریں چٹخاتی اور چھڑے کو کڑے سے بجاتی برکھا۔''

(یادوں کی برات، ص:۴۹)

جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی زندگی کے ان احوال وکوائف کا بھی اپنی خودنوشت میں ذکر کیا ہے جن سے انہیں دُکھ پہنچا مثلاً ہندوستان سے ہجرت اور پاکستان میں دشواریوں کا سامنا، انھوں نے بڑے ہی جذباتی انداز میں کیا ہے۔ یادوں کی برات کے ذریعہ مصنّف کے مذہبی نظریات اور عقائد پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جوش کے پاکستان میں مستقل طور پر قیام پذیر ہونے کے بعد کراچی میں جس ذہنی کرب اور صبر آزما حالات وحوادث سے دوچار ہونا پڑا اس کا اظہار جوش نے پرتکلّف اور تصنّع آمیز مقفّع زبان میں کیا ہے۔ حالاں کہ زبان ان حالات کے اظہار کی عکّاسی نہیں کرتی لیکن اندازِ بیان ان مجبوریوں کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے:

''اپنی اس آخری زندگی کا حال کیا بتاؤں جان کی امان پاؤں تو زبان ہلاؤں، اللہ اللہ یہ آب و ہوا کی ناسازگاری، یہ کراچی کی علم بے زاری، یہ پرانی یادوں کی کٹاریاں، یہ نئے ماحول کی آریاں، یہ مولد و منشا سے دوری، یہ غربت کی رنجوری، یہ سینے میں کھٹکتی پھانسیں، یہ حالات کی اکھڑتی سانسیں، یہ دل پر چلتے بان، یہ سر پر کڑکتی کمان، یہ اخباروں کی ریشہ دوانیاں، یہ حکومت کی سرگرانیاں، یہ دوستوں کا فقدان، یہ معاشی بحران، اور یہ چہرۂ زندگی پر گرد و غبار کا غازہ اور یہ دوش پر عزّتِ نفس کا جنازہ۔'' (یادوں کی برات، ص:۲۳۸)

یہ اور اس طرح کے متعدد اقتباس اور مثالیں جوش کے جوشِ الفاظ اور سیلِ رواں کا پتہ دیتے ہیں۔ کل ملا کر یادوں کی برات کی عظمت کا راز جوش کے مختلف النوع مسائل، موضوعات اور حادثات کو خلّاقانہ ذہانت کے ساتھ دل چسپ اندازِ بیان اور دلکش اُسلوب کے ذریعہ پیش کرنے کا بہتر اور سنجیدہ کوشش ہیں۔

04.05 خلاصہ

اس سے قبل کی اکائی میں آپ نے خودنوشت سوانح حیات کے تاریخی پس منظر، خصوصیات اور فنّی و صنفی خوبیوں کی معلومات حاصل کیں۔ اب یہ ضروری ہے کہ اردو ادب میں مختلف ادوار میں لکھی گئیں خودنوشت سوانح عمریوں کے بارے میں جانکاری کے ساتھ ساتھ اہم خود نوشت سوانح نگاروں کے متعلق بھی معلومات حاصل کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ اردو زبان و ادب میں مختلف اصنافِ سخن کے ذریعہ انسانی جذبات و خیالات اور نظریات و محسوسات کی عکاّسی کی جا سکتی ہے، لیکن نثری صنف ادب میں معاشرتی و تاریخی حقائق کے ساتھ ساتھ مصنّفین کے نجی حالاتِ زندگی اور ذاتی محسوسات و تعلقات کی عکاسی ہوتی ہے اسے ہم خودنوشت سوانح حیات کہتے ہیں۔ عالمی سطح پر مختلف معروف زبانوں میں خودنوشت سوانح عمریاں (Autobiography) لکھنے کا چلن رہا ہے لیکن اردو میں خودنوشت سوانح عمری کو ایک صنف کا درجہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی ملا۔ اس اکائی میں آپ نے آزادی سے قبل کے مختلف خودنوشت سوانح عمریوں کے ساتھ ساتھ ان کے مصنّفین کے متعلق معلومات حاصل کی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اور ۱۹۴۷ء سے قبل جن معروف خودنوشت سوانح نگاروں کے متعلق آپ نے معلومات حاصل کیں ان میں عبد الغفور نسّاخ، مولانا جعفر تھانیسری، ظہیر دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور سر سید رضا علی کے نام قابلِ ذکر ہیں کیوں کہ بالترتیب نسّاخ کی ''سوانح حیات'' ۱۸۸۶ء، مولانا جعفر تھانیسری کی ''تاریخِ عجیب'' ۱۸۷۹ء، ظہیر دہلوی کی ''داستانِ غدر'' ۱۸۵۷ء، مولانا آزاد کی ''تذکرہ'' ۱۹۱۹ء اور سر رضا علی کی ''اعمال نامہ'' ۱۹۴۳ء میں منظرِ عام پر آئیں۔

ملک کی آزادی کے فوراً بعد کئی خودنوشت سوانح عمریاں سامنے آئیں جن میں نواب سعید حسن خان چھتاری کی ضخیم خودنوشت ''یادِ ایاّم'' دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ کم و بیش مولانا حُسین احمد کی خودنوشت ''نقشِ حیات'' انہی دنوں منظرِ عام پر آئی۔ آزادی کے بعد شائع ہونے والی خودنوشتوں میں ظفر احمد ایبک کی ''آپ بیتی'' بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ دیوان سنگھ مفتون کی ''ناقابلِ فراموش''، عبدالغفار مدھولی کی ''ایک طالبِ علم کی کہانی''، ہوش بلگرامی کی ''مشاہدات''، عبدالمجید سالک کی ''سرگزشت''، چودھری خلیق الزّماں کی ''شاہراہِ پاکستان''، شورش کاشمیری کی ''بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل''، کلیم الدین احمد کی ''اپنی تلاش میں''، گوپال متل کی خودنوشت ''لاہور کا جو ذکر کیا''،

رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری''،عتیق احمد صدیقی کی ''یادوں کے سائے''، احسان دانش کی ''جہان دانش''، ہمایوں مرزا کی ''میری کہانی میری زبانی''، مرزا ادیب کی خودنوشت ''مٹی کا دِیا''، عبدالماجد دریابادی کی ''آپ بیتی''، قرۃ العین حیدر کی ''کارِ جہاں دراز ہے''، کنور مہندر سنگھ بیدی کی ''یادوں کا جشن''، وزیر آغا کی ''شام کی منڈیر سے''، کشور ناہید کی ''بری عورت کی کتھا'' اور معروف شاعر اختر الایمان کی خود نوشت سوانح حیات ''اس آباد خرابے میں'' بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔ لیکن آزادی کے بعد جن معروف خودنوشت سوانح نگاروں نے خودنوشت کی صنف میں خاطر خواہ اضافہ کیا ان میں شادؔ عظیم آبادی، یوسف حُسین خاں، جوشؔ ملیح آبادی، خواجہ غلام السیدین اور مشتاق احمد یوسفی کی خود نوشت سوانح عمریاں بہت ہی اہمیت کی حامل ہیں۔

آپ نے اس اکائی میں شادؔ عظیم آبادی کی خودنوشت ''شاد کی کہانی، شاد کی زبانی'' کی مختلف تاریخی حقائق اور ناقدین کے تجزیہ کا مطالعہ کیا، یوسف حُسین خاں جو دراصل تنقید، تاریخ اور ادب بالخصوص غزل اور اقبالیات کے ماہر مانے جاتے ہیں کی خودنوشت سوانح حیات ''یادوں کی دنیا'' کی فنّی و ادبی خوبیوں سے روشناس ہوئے۔ اور آزادی کے بعد تنقید و تعریف اور چرچا میں رہنے والی خودنوشت ''یادوں کی برات'' کا مطالعہ بھی کیا اور اس سے متعلق مختلف مبصّرین کی رائے سے بھی آگاہ ہوئے۔ امید ہے کہ آپ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد لکھی جانے والی خودنوشت سوانح نگاروں کی تصنیفات پر آسانی سے اپنی رائے قائم کرسکیں گے۔

04.06 فرہنگ

لفظ	معنی	لفظ	معنی
استقامت	مضبوطی، ثابت قدمی	سوانح حیات	زندگی کے واقعات
بردباری	برداشت، تحمل، صبر	سیاہ بخت	بدقسمت، بدنصیب
بے کم وکاست	بغیر گھٹائے بڑھائے، ٹھیک ٹھیک	صدق وصفا	سچائی، راست بازی
تعلّی	بلندی، برتری، شیخی، ڈینگ، گھمنڈ	عکاسی کرنا	شبیہ اُتارنا، تصویر کشی کرنا
تفاخر	فخر، ناز، گھمنڈ	عندیہ	رائے لینا، مافی الضمیر معلوم کرنا، بھید، منشا
جبر واستبداد	ظلم وزیادتی، جور وجفا	غریب الدّیار	مسافر، پردیسی، بے گھر
جواں بخت	اقبال مند، اچھی قسمت والا، خوش قسمت	مسمّٰی	موسوم، نامی، نام سے
خال خال	اِکّا دُکّا، کوئی کوئی	ملفوظات	اولیائے کرام کا کلام، وہ کتاب جس میں کسی بزرگ کی کیفیت ان کی زبانی لکھی گئی ہو
خودستائی	اپنی تعریف آپ کرنا، اپنے منہ میاں مٹھو بننا		
دارالہجرت	ہجرت کی جگہ (مدینہ منورہ)	ناآشنائے عصر	زمانے سے بے خبر
دروغ گوئی	کذب، جھوٹ بولنا	ناگفتہ بہ	جسے بیان نہ کیا جاسکے
دہقانی	گنوار، دیہاتی، اُجڈ	وصیت	سفر پر جانے یا موت کے قریب ہونے والے شخص کی نصیحت
رَمل	نجوم، جوتش، ہندسہ کا علم		
ریشہ دوانی	رقابت رکھنا، رشک، ہم سری، مقابلہ کرنا	وقعت	زور، طاقت، بلندی، اعتبار، ساکھ

04.07 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبرا اُردوخودنوشتوں میں ’’تذکرہ‘‘ کا مقام بتایئے۔

سوال نمبر۲ مولانا آزاد کی طرزِتحریر سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

سوال نمبر۳ آزادی کے بعد کی خودنوشتوں نگاری کا مختصر جائزہ لیجئے۔

سوال نمبر۴ اُردوخودنوشتوں میں ’’داستانِ غدر‘‘ کا مقام متعین کیجیے۔

سوال نمبر۵ ’’جوش ملیح آبادی کی نثر بھی نظم کی طرح ہی جوشیلی ہے‘‘ تنقیدی تبصرہ کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبرا سرسیدرضاعلی کی خودنوشت سوانح نگاری کا تنقیدی تجزیہ کیجیے۔

سوال نمبر۲ خودنوشت سوانح حیات اپنے عہد کی عکاس ہوتی ہے بحث کیجیے۔

سوال نمبر۳ جوش ملیح آبادی کی خودنوشت نگاری کی نثری خوبیوں کو اُجاگر کیجیے۔

سوال نمبر۴ شادعظیم آبادی کی تصنیف ’شاد کی کہانی شاد کی زبانی‘ پر تنقیدی نوٹ قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۵ آزادی کے بعد خودنوشت سوانح نگاری کی ترویج وترقی پر ایک مدلل نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر۶ آزادی سے قبل کے خودنوشت سوانح نگاروں میں مولانا جعفر تھانیسری کی حیثیت واضح کیجیے۔

04.08 حوالہ جاتی کتب

ا۔	جوش ملیح آبادی بحیثیت نثر نگار	از	ڈاکٹر جعفر عسکری
۲۔	اردو نثر کا فنّی ارتقا	از	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۳۔	اردو خودنوشت، فن وتجزیہ	از	ڈاکٹر وہاج الدین علوی
۴۔	اردو میں خودنوشت سوانح حیات	از	ڈاکٹر صبیحہ انور

بلاک نمبر 02

اکائی	05	خاکہ نگاری کا فن	محمد افضل حُسین
اکائی	06	اُردو کے اہم خاکہ نگار	محمد افضل حُسین
اکائی	07	سفرنامہ کا فن	پروفیسر نعمان خاں
اکائی	08	اُردو کے اہم سفرنامہ نگار	پروفیسر نعمان خاں

اکائی 05 خاکہ نگاری کا فن

ساخت

05.01 : اغراض ومقاصد
05.02 : تمہید
05.03 : اردو میں خاکہ نگاری کی روایات
05.04 : خاکہ کی تعریف
05.05 : خاکے کے اہم اجزائے ترکیبی
05.06 : خاکے اور سوانح یا سیرت میں فرق
05.07 : خاکے کے لئے موضوع اور مواد
05.08 : خاکہ نگاری کی شرائط وہدایات
05.09 : خلاصہ
05.10 : فرہنگ
05.11 : سوالات
05.12 : حوالہ جاتی کتب

05.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ خاکہ نگاری کے فن سے متعلّق پڑھیں گے۔اس اکائی میں آپ اردو میں خاکہ نگاری کی روایات وتعریف، خاکہ کے اہم اجزا کے بارے میں تفصیل سے جان سکیں گے۔اس سبق کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ خاکہ اور سوانح یا سیرت کے بارے میں مکمّل معلومات حاصل کر سکیں گے اور دونوں میں خطِّ امتیاز کھینچ سکیں گے۔موضوع ومواد اور شرائط وہدایات پر بھی مفصّل گفتگو کی جائے گی۔آخر میں الفاظ ومعانی، نمونہ امتحانی سوالات اور سفارش کردہ کتب کی فہرست بھی دستیاب کرائی جائے گی۔

05.02 تمہید

اردو ادب میں خاکہ نگاری ایک علاحدہ صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔اس کے اشارے یا اس کی مبہم تصویریں ہم چاہیں تو داستانوں میں تلاش کریں یا محمد حسین آزاد کے تذکرے یعنی آبِ حیات میں ڈھونڈیں۔غرض کہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کے بعد خاکہ نگاری کی اپنی پہچان الگ قائم ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا۔ترقّی کی شروعاتی منازل میں اردو خاکہ نگاری پر انگریزی ادب کا اثر نظر آتا ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو کے ادیبوں نے بنیادی طور پر نہایت جاں فشانی سے اس کی پرورش و پرداخت کا ذِمّہ اُٹھایا اور اس کو رعنائی و زیبائی عطا کی۔ خاکہ نگاری کے کاکل وگیسو سنوارے۔ ان اصحاب میں تذکرہ نویس، سوانح نگار، افسانہ نگار، مزاح نگار سبھی لوگوں کی اپنی اپنی کاوشیں شامل تھیں۔ اس طرح کئی اصناف کی خوبیوں سے خاکہ نگاری نے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ اپنا منفرد اُسلوب کا بھی خاکہ کے فن کی تشکیل میں اہم حصہ رہا ہے۔ انگریزی ادب نے اسے نئی کیفیات سے روشناس کرایا۔ فی زمانہ خاکہ نگاری اردو ادب ایک مضبوط و مستحکم صنف کے طور پر موجود ہے۔ جس کے دامن میں تخلیقات کا بہترین اور کثیر سرمایہ موجود ہے۔

05.03 اُردو میں خاکہ نگاری کی روایات

اُردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایات کب اور کیسے ہوئی اس کے متعلّق حتمی طور کچھ کہنا فی الحال ممکن نہیں۔ یوں تو خاکہ نثری صنف ہے۔ اس وجہ سے اس کے ابتدائی نقوش نثری اصناف تلاش کرنا فائدہ مند ہے لیکن نثر سے پہلے ہمارے یہاں شاعری کا رواج عام ہوا جن میں قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی تین بڑی اصناف شاعری ہیں اور ان تینوں میں اصناف میں شخصی خاکے ملتے ہیں خصوصاً قصیدہ اور مرثیہ اس سلسلے کی اہم و معتبر کڑیاں ہیں۔ نثر میں ان کے نقوش تذکروں میں موجود ہیں خواہ وہ ''نکات الشعرا'' (میر تقی میر)، ''گلشنِ بے خار'' (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ)، ''طبقات شعرائے ہند'' (مولوی کریم الدین)، یا ''آبِ حیات'' (محمد حسین آزادؔ) ہوں لیکن ان تذکروں میں ''آبِ حیات'' کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر شخصی خاکے ناقص و نامکمّل اور غیر موثر ہیں کیوں کہ ان کے سامنے نہ تو خاکوں کی روایت تھی اور نہ ہی وہ اپنی دانست میں خاکہ لکھ رہے تھے۔ ان کے بعد میں سرسید اور ان کے رفقاء نے جو سوانح عمریاں لکھی ہیں ان میں خاکے کی جھلک صاف پر طور نظر آتی ہے۔ چوں کہ یہ سوانح عمریاں کسی بھی شخصیت کا مکمّل احاطہ کرتی نظر آتی ہیں اس لیے ان میں اختصار کے بجائے طوالت کو اپنا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ہر ضروری غیر ضروری بات یا نقش کو عیاں کیا گیا ہے جو خاکے کے لئے ضروری بھی نہیں ہے۔

مذکورہ بالا حضرات میں سے محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں جن چند شعرا کی یعنی انشاؔء، مصحفیؔ اور ذوقؔ و غالبؔ کی قلمی تصاویر پیش کی ہیں وہ ہر حال میں دل چسپ و اہم ہیں۔ ان کے بعد خواجہ حسن نظامی نے اس میدان میں باضابطہ اپنے قدم آگے بڑھائے اور دلّی کی معروف و مشہور ہستیوں کی منھ بولتی اور چلتی پھرتی تصاویر ''قلمی چہرے'' کے نام سے پیش کیں۔ خواجہ صاحب کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' اور ''دلّی کا یادگار مشاعرہ'' کے نام آتے ہیں۔ اس میدان میں مولوی عبدالحق کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی ضمن میں رشید احمد صدیقی کے خاکوں کا مجموعہ ''گنج ہائے گراں مایہ'' ۱۹۳۷ء، ''ہم نفسانِ رفتہ'' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئے اور بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ ذاکر صاحب پر آپ نے ایک پُر اثر خاکہ ۱۹۶۲ء میں رقم کیا تھا۔ ''آشفتہ بیانی میری''، مضامینِ رشید'' اور ''خنداں'' میں بھی دل چسپ خاکے ملتے ہیں۔

مذکورہ بالا ادیبوں کے علاوہ جن دیگر ادیبوں نے خاکوں کی مدد سے اردو ادب کو ثروت مند بنانے کی کاوشیں کیں ان میں سید عابد حسین (کیا خوب آدمی تھا)، مولوی عبد الرزاق کانپوری (یادِ ایّام)، فکر تونسوی (خدوخال)، عصمت چغتائی (دوزخی)، سعادت حسن منٹو (گنجے فرشتے، لاؤڈ اسپیکر، شخصیتیں)، اشرف صبوحی دہلوی (دلّی کی چند عجیب ہستیاں)، شوکت تھانوی (شیش محل، قاعدے بے قاعدہ)، ڈاکٹر اعجاز حسین (ملکِ ادب کے شہزادے)، شاہد احمد دہلوی (گنجینۂ گوہر)، محمد طفیل مدیر نقوش (صاحب جناب، محترم، مکرم، آپ)، رئیس احمد

جعفری (مردم دیدہ)، چراغ حسن حسرت (مداوا، ناروا، خوں بہا)، غلام احمد فرقت (حسرت موہانی)، عبدالمجید سالک (یارانِ کہن)، مجتبیٰ حسین (آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ)، مظہر امام (اکثر یاد آتے ہیں)، انور ظہیر خاں (مت سہل ہمیں جانو)، کشمیری لال ذاکر (آشنا چہرے)، امداداللہ ندوی (انجمن کے چند روشن چراغ)، ندا فاضلی (چہرے)، خالد محمود (شگفتگی دل کی) وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اُردو کی خاکہ نگاری کی روایات کو مذکورہ بالا ادیبوں نے دوام واستحکام بخشا ہے اور اسے ایک خاص صنف کی حیثیت دلانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور قابل مطالعہ بنانے میں اپنا اپنا رول ادا کیا ہے۔

05.04 خاکہ کی تعریف

خاکہ اردو زبان کا لفظ ہے جب کہ انگریزی زبان میں اس کے متبادل الفاظ (Profile,Pen Portrait,Literary sketch,Pen sketch,Sketch) ہے۔ جس کا انگریزی زبان میں مفہوم یہ ہے۔'' A Rough Drawing and Painting'' خاکہ کا لغوی مفہوم ڈھانچہ، کچا نقشہ، تصویر کا مسودہ یا لکیروں سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں۔

لفظ خاکہ کے لیے اردو میں مرقّع، شخصی مرقّع، قلمی تصویر، شخصی تصویر یا جیتی جاگتی تصویر جیسی اصطلاحیں مستعمل ہیں۔ یہ تمام اصطلاحیں حقیقی شخصیات پر لکھے گئے خاکوں کے لئے استعمال ہورہی ہیں۔لیکن ان اصطلاحوں کے بالمقابل خاکہ کی اصطلاح حقیقی وخیالی دونوں شخصیات کے لیے عام طور مقبول و پسندیدہ ہیں۔ان کا مفہوم عام طور سے ایک جیسا ہی ہے جیسا کہ مذکورہ الفاظ سے ظاہر ہے۔

ادبی اصطلاح میں خاکے سے مراد وہ تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر اشارے کنایے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ، عادات و اطوار، گفتار و کردار کو سیدھے سادے اور اچھے انداز میں مبالغہ کے بغیر اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی چلتی پھرتی تصویر نظر کے سامنے آجائے یعنی اس کی شخصیت کے نمایاں اوصاف ظاہر ہوجائیں کہ جن سے اس کی شخصیت اُبھرتی اور نمایاں معلوم ہوتی ہو۔جس کا خاکہ تحریر کیا جائے اس کے افکار و خیالات بھی اُبھر سامنے آجائیں۔خاکہ کسی شخص سے وابستہ عقیدت، احترام، محبت، دوستی، دل چسپی اور یادوں کی ایک لفظی تصویر ہوتی ہے جو کسی جگہ نہایت بے ساختہ انداز میں شروع ہوکر غیر روایتی انداز میں اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔اس نکتے کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ خاکے میں شخصیت یا اس کے علمی یا سیاسی کارناموں کا تنقیدی جائزہ پیش نہیں کیا جاتا ہے۔

انور ظہیر خاں خاکہ سے متعلّق اپنا خیال پیش کرتے ہیں:

> ''خاکہ کسی جسمانی اور ذہنی وجود کا ایکسرے ہوتا ہے یا پوسٹ مارٹم رپورٹ.........اس میں شخصیت کو اس کے اصلی چہرے مہرے، رفتار و افکار اور احوال وآثار کے ساتھ ایک شگفتہ، شیریں، سلیس اور رواں دواں پیرایہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں دال میں نمک کے برابر تخیّل کی کارفرمائی تو ہوسکتی ہے لیکن ابہام، مبالغے اور غلو کی آمیزش ناقابل قبول ہوتی ہے۔اس میں داخلی اور خارجی عناصر کو ہم آمیز کر کے دودھیا کاغذ پر اس طرح رکھ دیا جاتا ہے کہ تمام تر حقیقت بیانیوں اور سفّا کیوں کے ساتھ خاکے کے کردار سے ذاتی ربط وضبط اور ہمدردی کا جذبہ موجِ تہہ نشیں کی طرح موجود ہو۔ ورنہ خاکہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہوجائے گا اور خاکہ نگار کا وقار مجروح ہوگا۔''
>
> (دیباچہ: مت سہل ہمیں جانو، ص ۱۰)

انگریزی زبان میں خاکہ کے متبادِل الفاظ'' (Profile, Pen Portrait, Literary sketch, Pen sketch,Sketch)'' وغیرہ جیسے الفاظ مستعمل ہیں جس طرح کہ اردو زبان میں مروّجہ اصطلاحات میں آپسی افتراق ہے اسی طرح انگریزی اصطلاحات میں بھی ہے۔ لیکن اس سے کسی بھی صورت میں خاکہ کے مفہوم پر کوئی فرق وحرف نہیں آتا۔لفظوں کا محل استعمال بتاتا ہے کہ مذکورہ بالا الفاظ واصطلاحات کا استعمال ہم مختلف موقعوں پر مختلف معانی کے طور پر کرتے نظر آتے ہیں۔خاکہ یا مرقّع میں سوانح یا خودنوشت کی تاریخی وزمانی تسلسل کی قید نہیں ہوتی۔نثاراحمد فاروقی نے اسی موضوع کی مناسبت سے بہت صحیح لکھا ہے:

''خاکہ نگاری سوانح عمری سے مختلف چیز ہے کہ سوانح عمری میں خاکے کی گنجائش ہوتی ہے لیکن خاکے میں سوانح عمری مشکل سے سماتی ہے۔''

(دیدودریافت،از:نثاراحمد فاروقی ۱۹۶۴ء)

مذکورہ اقتباس سے ہرگز یہ نتائج اخذ نہیں کرنے چاہیے کہ خاکہ میں زندگی سے الگ حقائق ہوتے ہیں۔کیوں کہ جس شخصیت پر خاکہ لکھا جاتا ہے ظاہر ہے کہ اس کی زندگی کے واقعات اور اس کے خدوخال کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔البتہ بطورِفن دونوں میں اختصار وطوالت، آزادی اور پابندی کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ فرق ضرور پایا جاتا ہے۔خاکہ اور سوانح دونوں میں قدرِ مشترک کے طور پر ایک اور اہم چیز ہے اور وہ ہے ''حقیقی مواد'' یعنی دونوں کی بنیاد حقیقی مواد پر ہوتی ہے۔

05.05 خاکے کے اہم اجزائے ترکیبی

کسی بھی خاکہ کے حسب ذیل اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں:

﴿۱﴾ اختصار ﴿۲﴾ وحدت تاثر ﴿۳﴾ کردار ﴿۴﴾ اُسلوب یا طرزِ نگارش

﴿۱﴾ اختصار: کسی بھی خاکہ کے لئے اختصار کا ہونا لازمی ہے۔کیوں کہ خاکہ میں سوانح عمری یا خودنوشت کی طرح زیادہ طوالت کی گنجائش نہیں لہٰذا اس بنیاد پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اس فن میں ایجاز واختصار کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ خاکہ نگاری کم وبیش غزل کے فن سے مماثلت رکھتی ہے۔جس طرح غزل کے اشعار میں طویل مفہوم یا فلسفۂ حیات کو بھی آسانی سے پیش کر دیا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح خاکہ میں بھی کم سے کم الفاظ میں کسی شخصیت کا مرقّع پیش کر دیا جاتا ہے۔

جس طرح خراب مبتدی شاعر غزل میں اپنے موضوع کی پیش کش سے انصاف نہیں کر سکتا ٹھیک اسی طرح اگر خاکہ نگار بھی نثری اوصاف اور بالخصوص ایجاز کے فنّی رُموز واسرار واقف نہ ہو تو ایک کامیاب خاکہ تحریر نہیں کر سکتا۔ظاہر ہے کہ خاکہ شخصیت کی اختصار بیانی ہے اس لیے اس میں بے جا طوالت کی کوئی گنجائش نہیں۔ایسے بہت کم لوگ ہیں جو مرزا فرحت اللہ بیگ کی طرح طویل خاکہ تحریر کر سکیں۔چونکہ خاکہ میں اختصار سے کام لیا جاتا ہے اور اختصار سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی شخص کے اوصاف ومعائب اس طرح بیان کیے جائیں کہ جس کے اندر اختصار، جامعیت اور اَثر بھی لازمی ہونا چاہیے۔

﴿۲﴾ وحدت تاثر: خاکہ میں افسانہ کے مثل وحدت تاثر کا ہونا بھی انتہائی ناگزیر ہے اور یہ وصف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جس وقت کے خاکہ میں اختصار بیانی سے کام لیا جائے۔خاکہ نگار ''تاثر'' پیدا کرنے کے لیے انتہائی مہارت

اور باریک بینی سے خاکہ کی ابتدا کرتا ہے۔ پھر واقعات کے سہارے وہ اسے وسط سے لے جاتا ہے اور پھر اس کا خاتمہ مؤثر انداز میں کرتا ہے۔ ''ابتدا، وسط اور خاتمہ'' واقعات و تجربات اور مشاہدات کی مدد سے مربوط انداز میں پیش کرتا ہے جس سے وحدت تاثر کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

﴿۳﴾ **کردار:** کردار کسی بھی خاکے کے لیے ایک بنیادی عنصر ہے جس کے گرد خاکے کی عمارت بڑے تزک و احتشام سے تعمیر کی جاتی ہے۔ اس کے بغیر خاکہ کا تصوّر بے سود و محال ہے۔ افسانوی ادب میں جس طرح کردار کی اہمیت ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح خاکہ میں ہوتی ہے۔ ناول، افسانہ اور ڈرامے میں جس طرح مرکزی کردار ہوتے ہیں اسی طرح اس میں ایک مرکزی کردار لازمی ہوتا ہے دیگر اصناف میں چند ضمنی کرادر بھی ہوتے ہیں لیکن خاکے میں ضمنی کرداروں کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک آدھ کردار کی شمولیت محض اپنی بات کو پُر زور بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے ہم یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اکثر خاکے ایک کردار والے ہوتے ہیں اور اگر دوسرا کوئی اہم کردار ہوتا بھی ہے تو وہ راوی خود ہے۔ دیگر اصناف میں کرداروں کی جو اہمیت بتائی گئی ہے وہ اس میں بڑی حد تک لازمی ہے۔

یوں تو خاکہ میں کسی شخصیت کا محض سرسری اخلاق و اطوار کا بیان کر دینا بھی کافی ہوتا ہے لیکن ایک اچھے خاکے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اسے انسانی فطرت، انسانی نفسیات، جذبات و احساسات، عقائد و نظریات، پسند و ناپسندیدگی، عصبیت و کجروی، غرض یہ کہ خوبیوں کے ساتھ ہی خامیاں، کوتاہیوں کے حوالے سے بھی دیکھا اور دکھایا جائے۔ تب کہیں جا کر کسی کردار یا شخصیت کا مطالعہ مکمّل اور مؤثر سمجھا جائے گا۔ خاکہ نگار کے لیے یہاں یہ ضروری ہے کہ وہ بڑی حد تک معروضیت سے کام لے۔ کذب و افتراء اور بہتان طرازی سے بچے اور حقیقی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ہی کردار کو نمایاں کرے کیوں کہ ایسا کرنے سے ہی خاکہ میں ایک جاندار کردار بن کر اُبھرے گا۔

﴿۴﴾ **اُسلوب یا طرزِ نگارش:** خاکہ نگاری ایسی صنف نثر ہے جس کی اپنی شناخت ہے اور یہ شناخت اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب کہ اس کا اپنا کوئی منفرد اسلوب ہو۔ خاکوں میں مزاح کے پھول کھلائے جا سکتے ہیں لیکن خاکے کی نثر میں بذلہ سنجی کی کثرت اور مزاح کے بیجا بوجھ سے نثر بوجھل نہیں ہونی چاہیے۔ فطری طور پر اگر شگفتگی پیدا ہو جائے تو یہ اس کے ٹھوس اُسلوب کی دلیل ہوگی۔ انشائیہ نگاری کا اسلوب اس کی آزادی میں پوشیدہ ہے لیکن خاکہ نگاری میں ایسی کوئی آزادی نہیں۔ خاکہ نگاری میں خاکہ نگار کا خلوص اور اس کا ذاتی اندازِ تحریر ہی خاکہ کا اسلوب طے کرتا ہے۔ اسلوب بیان کے لیے خاکہ نگار بھاری بھرکم اصطلاحات اور ادق اور مغلق لفظیات سے اپنے ممدوح کو پس پردہ ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ چوں کہ خاکہ میں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور پوشیدہ ہوتا ہے لہٰذا اس کی ترسیل میں کسی طرح کی رکاوٹ بھی خاکے کے مقصد کو مجروح کرتی ہے۔ خاکہ ایک خود مکتفی صنف کے طور پر اردو ادب میں رائج ہو چکا ہے اس لیے اس کے پیرایۂ اظہار کو اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اُسلوب اب دوسرے اسالیب سے مستعار نہیں رہا البتہ اکتساب کے نشانات ضرور ملتے ہیں اگر چہ خاکوں میں معروضیت کی تلاش بے معنی ہے لیکن اس کے اسلوب میں ایک طرح معروضیت ہوتی ہے۔ یہ معروضیت اور قطعیت اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ خاکہ نگار اپنی ساری توجہ اپنے ممدوح و موصوف پر مرکوز رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں انشائیے کی طرح بھٹکنے کے مواقع بہت کم آتے ہیں۔

خاکے بیانیہ نثر میں لکھے جاتے ہیں۔ چوں کہ اس صنف میں خاکہ نگار اور ممدوح کے ابعاد ہوتے ہیں اس لیے اگر بیانیہ اسلوب نثر سے کام نہ لیا جائے تو دونوں میں تعلق پیدا کرنا مشکل ہو جائے۔ اس بیانیہ اُسلوب میں لفظوں اور محاوروں کے برتنے میں خاص احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ ضرب الامثال اور روزمرّ وں پر اگر خاکہ نگار کو قدرت حاصل ہے تو اُسلوب سادہ و پرکار، شگفتہ اور اثر انگیز تشکیل پاتا ہے۔ انشائیہ نگاری میں یہی اُسلوبِ نگارش دل کشی پیدا کرتا ہے لیکن جہاں انشائیہ میں ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے، خاکہ نگاری میں بے جا طوالت، بے جا مبالغہ آرائی، لفظوں کا اسراف، موضوع سے الگ ہٹنا وغیرہ عیوب کے زُمرے میں آتے ہیں۔

خاکہ نگاری میں حد درجہ شعری اسلوب اپنانے سے بھی غیر فطری پن پیدا ہو جاتا ہے۔ لفظی تحشّم اور تراکیب کی گراں باری سے پرہیز کرنے کے بعد ہی خاکہ نگاری کا اپنا اسلوب وضع ہو سکتا ہے۔ اچھا خاکہ وہی لکھ سکتا ہے جس کا ذہن اصطلاح سازی میں نہیں اُلجھے۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی بڑے ناقد نے اچھے خاکے نہیں لکھے۔ کسی بھی خاکہ کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار خاکہ نگار کے اُسلوب اور طرزِ نگارش پر ہی ہے اس لیے یہ کسی بھی خاکہ کا سب سے اہم عنصر ہے۔

05.06 خاکے اور سوانح یا سیرت میں فرق

خاکے میں جہاں کسی شخصیت کی جھلک پیش کی جاتی ہے تو وہیں سوانح میں کسی کی زندگی کی تفصیلات مکمّل جزئیات کے ساتھ پیش کرنا ہوتی ہیں۔ خاکے میں یہ گنجائش نہیں ہوتی کہ کسی شخصیت کے علمی فتوحات اور دیگر کارناموں کا جائزہ پیش کیا جائے البتہ سوانح میں اس کی پوری گنجائش موجود ہوتی ہے۔ سوانح میں مکمّل تفصیل کے ساتھ ممدوح کی شخصیت کو پیش کیا جاتا ہے لیکن خاکے میں اس طرح غیر ضروری تفصیلات کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔

اسی لیے خاکہ نگار کے لیے لفظوں کو برتنے کی حد تک کفایت شعاری پر دسترس ہونا لازمی ہے۔ کسی کی سیرت میں مضحکہ پہلو کے عناصر ہو سکتے ہیں لیکن خاکے یا مرقعے میں اس کی گراں باری سے خاکہ نگاری کے فن کا توازن بگڑ سکتا ہے۔ اس لیے خاکہ نگار کو محتاط طریقے سے اپنے اُسلوب کو قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اگر ماہر نثر نگار نہ ہو تو خاکہ اور وہ بھی ایک کامیاب خاکہ لکھنا اس کے لیے مزید مشکل ہو جائے گا۔ اور اگر اس نے کوشش کی تو ممکن یہ ہے کہ خاکہ کسی کارٹون میں تبدیل ہو جائے جو کہ بلا شبہ فن خاکہ نگاری کے منصب کے منافی ہوگا۔ حالاں کہ انگریزی میں اسٹیل اور ایڈیسن کے کرداری خاکوں میں انشائیہ اور مزاح کے عناصر سے شگفتگی و تازگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مگر اردو میں اس ڈگر پر چلنا خطرے سے خالی نہیں۔ البتہ اتنی بات طے ہے کہ اگر خاکہ نگار خوش مذاق اور بذلہ سنج ہے تو اس کی تحریروں میں شگفتگی اور بے تکلّفی اپنے آپ ہی پیدا ہو جائے گی۔ جیسے مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریر ''نذیر احمد کی کہانی'' سے ایک مختصر اقتباس پر نظر ڈالتے ہیں جس میں حقیقت حال سے انحراف نہ ہونے کے باوجود بھی خوش مذاقی اور شگفتہ اندازِ تحریر سے مزاح کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

> ''خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے۔ ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے۔ میوے کا بڑا شوق تھا۔ ناشتہ اور کھانے کے ساتھ میوے کا ہونا لازمی تھا۔ پڑھاتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریکِ طعام نہ ہو سکا۔ خیر پٹھانوں کی جماعت کی کیا

صلاح لیتے، ان کے منھ میں مولوی صاحب کا ناشتہ اونٹ کی داڑھ میں زیرہ ہوجاتا، البتہ ہم دونوں صلاح نہ کرنا غضب تھا۔ کہتے بھی جاتے تھے ''بھئی کیا خربوزہ ہے، میاں کیا مزے کا آم ہے'' مگر بندۂ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ذرا چکھ کرتو دیکھو کہ یہ کیسا ہے۔ میں نے تو یہ تہیّہ کرلیا تھا (میاں دانی اب انکار کریں تو کریں، لیکن ان کا بھی ارادہ یہی تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منھ سے شریک ہونے کو کہیں تو سچ مچ شریک ہو جائیں۔''

اسی طرح ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریر ''استاد رسا دہلوی'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ایک دفعہ ہندوستان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے استاد پٹھانوں کو من من بھر گالیاں دے رہے تھے۔ میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اچانک استاد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، یعنی انہیں خیال آ گیا کہ میں بھی پٹھان ہوں۔ فوراً بات بدل دی، ''میاں سب پٹھان ایک سے تھوڑے ہوتے ہیں ان میں کچھ ایسے شریف اور نیک بھی ہوتے ہیں جن کے آگے سیّد کچھ بھی نہیں۔ اب جیسے یہ میرا بھتیجا ہے اس کے خاندان کے کسی فرد سے ملیے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں سے ملاقات ہو رہی ہے۔''

(حالاں کہ استاد کی میرے خاندان کے بارے میں ایمان داری سے یہ رائے نہیں ہے۔)''

05.07 خاکہ کے لئے موضوع اور مواد

اصنافِ ادب میں سے کسی بھی صنف کو کامیابی سے برتنے کے لیے موضوع اور مواد کا مناسب انتخاب اور اس سے متعلّق دل چسپی لازمی وضروری ہے۔ یہ نظریہ خاکہ نگاری کے مزید اہم ہوجاتا ہے۔ چوں کہ اس میں وسعت کم ہونے کے باوجود بہت کچھ بیان کرنا ہوتا ہے اسی لیے موضوع کے انتخاب میں بڑے حزم واحتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاکے میں منتخب کردہ شخصیت کے بارے میں خاکہ نگار کو جتنی بھی واقفیت ہوتی ہے اس میں یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ کس کس گوشے کو خاکے کا حصّہ بنایا جاسکتا ہے اور کس گوشے کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

موضوع اور مواد یعنی پہلے شخصیت (ممدوح) کا انتخاب پھر اس سے متعلق مواد مہیّا کرنا ایک بڑا اور اہم کام ہوتا ہے۔ اس مرحلے کے بعد خاکہ نگار یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس شخصیت سے متعلق جمع کیے گئے یا ذاتی واقفیت پر مبنی مواد کیا کچھ ہے جو کہ خاکہ میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ موضوع کے لیے بڑی شخصیت کا ہونا ضروری نہیں۔ البتہ خاکہ اس آدمی کا دل چسپ ہوسکتا ہے جس کی زندگی میں ڈرامائی عناصر ہوں یا اس کی زندگی کے نشیب وفراز اور روز وشب معمولاتِ زندگی سے قدرے مختلف ہوں۔ لیکن جو ماہر اور منجھے ہوئے فن کار اور خاکہ نگار ہوتے ہیں وہ لوگ عام اور غیر دل چسپ موضوعات میں بھی اپنی قوّتِ تخلیق اور فنّی بصیرت کی مدد سے خاکے میں جان ڈال دیتے ہیں۔

اسی تعلق سے پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''باکمال لکھنے والوں نے، بہ ظاہر عام اور غیر دل چسپ دکھائی دینے والی شخصیتوں کے بھی ایسے خاکے لکھے ہیں جو ہماری بصیرتوں، ہمارے احساسات، ہماری فکر اور ہمارے جذبات کو کسی نہ کسی طرح اپنے حصار میں لے لیتے ہیں۔ مانوس حقیقتیں غیر مانوس بن جاتی ہیں اور عام انسانی اوصاف غیر معمولی نظر آنے لگتے ہیں۔

کامیاب خاکہ نگار وہ ہے جس کی آستین میں روشنی کا سیلاب چھپا ہوا ہو اور جو واقعات کی اُوپری پرت کے نیچے، معمولات کے ہجوم میں کھوئی ہوئی، ایسی حقیقتوں کو بھی اپنی گرفت میں لے سکے جن تک عام لکھنے والوں کی نگاہ پہنچتی ہی نہیں۔اسی لیے ہر اچھا خاکہ ایک دریافت ہوتا ہے، کسی کہانی یا شعر کی طرح۔ہم اس کے واسطے زندگی کی کسی عام سچائی تک پہنچنے کے بعد بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سچائی کو ہم نے آج ایک نئے زاویے سے دیکھا ہے۔اور یہ کہ معنی کی ایک نئی جہت ہم پر روشن ہوئی ہے۔''

(مقدمہ:''آزادی کے بعد دہلی میں اُردو خاکہ،شائع کردہ: اُردو اکادمی،ص۱۰)

خاکہ کے حوالے سے موضوع (ممدوح) کے انتخاب میں کیا بات اہم ہوتی ہے اس کا اندازہ مذکورہ بالا اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہماری نظر مولوی عبدالحق کے ذریعے تحریر کردہ دو خاکوں پر پڑتی ہے ان میں ایک کا نام ''دیو...مالی'' اور دوسرے کا نام ''گدڑی کا لال...نور خاں'' ہے۔اس بات کی مزید تصدیق کے لیے مولوی عبدالحق کے مشہور خاکے ''گدڑی کا لال..نور خاں'' سے شروع کا اقتباس کا مطالعہ کرتے ہیں جس سے خاکہ نگاری سے متعلق ان کی تنقیدی فکر کا اندازہ ہوجاتا ہے:

''لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں۔میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں کے ہی حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہوسکتی ہے۔انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں کوئی امیر اور غریب کا کوئی فرق نہیں۔''

اب یہ بات مزید واضح ہوگئی کہ سوانح نگاری کی طرح خاکہ نگاری میں بھی ممدوح کا عظیم یا بہت اہم ہونا ضروری نہیں۔ایمرسن نے کسی موقع پر لکھا تھا کہ ایک عظیم آدمی کی ضرورت ہے تاکہ ایک عظیم تر آدمی کی تشریح ہوسکے۔

05.08 خاکہ نگاری کی شرائط وہدایات

﴿۱﴾ خاکہ نگار یہ کوشش کرے کہ ممدوح کی شخصیت کے کھولنے میں اس کے ذہنی میلانات اور نفسیات تک رسائی حاصل ہو جائے۔

﴿۲﴾ جس شخصیت کا خاکہ تحریر کیا جارہا ہے اس کے چہرے بشرے اور اس کی نشست و برخاست کی پیش کش میں خاکہ نگار زیادہ نمک مرچ نہ لگا کر پیش کرے۔

﴿۳﴾ حد درجہ جزئیات نگاری اور علمی فتوحات سے پرہیز کرے۔

﴿۴﴾ کسی بڑی شخصیت کا خاکہ لکھنے کے لیے اس کے عہد کے سیاسی وسماجی، ادبی خیالات اور سرگرمیوں سے بھی واقف ہونا بہت ضروری ہے۔

﴿۵﴾ شخصیت یا اس کے کسی کارنامے پر خاکہ نگار اپنی تنقیدی رائے دینے پر ہیز کرے۔

﴿۶﴾ ذاتی پسند و ناپسند سے زیادہ خاکہ نگار ممدوح کے سچے حالاتِ زندگی اور حرکات وسکنات پر نظر رکھے۔

﴿۷﴾ خاکہ نگار اپنے ممدوح سے ہمدردی ضرور رکھے لیکن جانب داری سے بھی پرہیز کرے۔

﴿۸﴾ خاکہ محض زبان کے چٹخارے کے لیے نہیں لکھا جائے بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی سبق آموز پہلو بھی ہو۔

﴿۹﴾ ممدوح کی شخصیت کو خاکہ نگار خود پر کبھی بھی حاوی نہ ہونے دے اور نہ خود اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرے۔

﴿۱۰﴾ خاکہ میں زبردستی مزاح پیدا کرنے سے اس کا پورا نظامِ نثر مجروح ہوسکتا ہے۔

05.09 خلاصہ

اردو ادب کی نثری اصناف میں خاکہ نگاری ایک اہم صنف ہے اور اس کو علاحدہ صنف کی حیثیت سے قبول کرلیا گیا ہے۔لفظ خاکہ کی جگہ اردو میں مرقع، شخصی مرقع، قلمی تصویر، شخصی تصویر یا جیتی جاگتی تصویر جیسی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔انگریزی زبان میں بھی چند متبادل اصطلاحیں جاری ہیں جیسے Profile, Pen Portrait, Literary sketch, Pen sketch, Sketch وغیرہ۔کسی خاکہ کے اہم اجزا اختصار، وحدت تاثر، کردار اور اُسلوب یا طرزِ نگارش ہوتے ہیں اردو میں خاکہ نگاری کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی اس کے بارے میں قطعی طور کچھ کہنا سردست ممکن نہیں۔نثری اصناف میں شامل ہونے کے سبب اس کے ابتدائی نقوش نثر میں ہی تلاش کرنا فائدہ مند ہے۔اس اکائی میں آپ نے اردو میں خاکہ نگاری کے فن کے ضمن میں اردو میں خاکہ نگاری کی روایات، خاکہ کی تعریف، خاکہ کے اہم اجزا، خاکے اور سوانح یا سیرت میں فرق، خاکہ کا موضوع اور مواد اور شرائط و ہدایات کے تعلق سے مطالعہ کرکے آپ کی معلومات میں یقیناً اضافہ ہوگا۔اس اکائی کے آخر میں الفاظ و معانی، نمونہ امتحانی سوالات اور ساتھ ہی میں حوالہ جاتی کتب کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

05.10 فرہنگ

آمیزش	: ملاوٹ، ملونی	سرمایہ	: دولت، پونجی
ابہام	: پوشیدگی	سفّاکی	: خوں ریزی
احتشام	: ٹھاٹھ	شمولیت	: شامل
اختتام	: آخر ہونا، ختم ہونا	ضرب الامثال	: کہاوتیں
اختصار	: چھوٹا کرنا	ضمن	: اندر، تحت
اسرار	: سِرّ کی جمع، بھید	طرزِ نگارش	: لکھنے کا طریقہ
اسراف	: فضول خرچی	طوالت	: بڑا کرنا
اسلوب	: طریقہ، طرز	عصبیت	: طرف داری
افترا	: بہتان، جھوٹ باندھنا	عیاں	: ظاہر
افتراق	: جدائی، پھوٹ ڈالنا	غلو	: بڑھا چڑھا کر پیش کرنا
افکار	: فکر کی جمع، سوچ، غور	غیر فطری پن	: بناوٹی، مصنوعی
اکتساب	: ذاتی محنت سے حاصل کرنا، پیدا کرنا	کاکل و گیسو	: بال، زلفیں

اوصاف	وصف کی جمع، خوبی، صفت	کاوشیں	تلاش، کھوج
ایجاز	چھوٹا	کج رَوی	ٹیڑھا پن
باریک بینی	باریکی سے سوچنے والا	مبالغہ	حد سے زیادہ بڑھانا
بذلہ سنجی	لطیفہ گوئی	مبتدی	شروع کرنے والا
برشت	بھُنا ہوا	مبہم	پوشیدہ
بنیاد	نیو، جڑ	متبادل	بدل
بہتان طرازی	تہمت لگانا	مجروح	زخمی، خراب
پرورش و پرداخت	پالنا پوسنا اور سنوارنا	محتاط	احتیاط کیا ہوا
پرہیز	بچنا، دور ہونا	مذکورہ	ذکر کیا ہوا
تحشم	غصہ دکھانا	مربوط	ملا ہوا، جڑا ہوا
تُزک	ترتیب، انتظام	مرقّع	تصویروں کی کتاب
تسلسل	سلسلہ بندی، لڑی	مزاح	خوش طبعی
تشکیل	شکل بنانا	مستعار	اُدھار
ثروت مند	مال دار	مستعمل	استعمال میں لایا ہوا
جانب داری	طرف داری کرنا	مشترک	شرکت
جاں فشانی	کڑی محنت	مطالعہ	پڑھنا
حاوی	چھا جانے والا	معائب	عیب
حقائق	حقیقت کی جمع، اصلیت	ملحوظ	لحاظ کیا ہوا
حق بجانب	سچے	مماثلت	ہم مثل، مانند
خدوخال	ابتدائی شکلیں	ممدوح	جس کی تعریف کی جائے
دانست	آگاہی، جان بوجھ	منتخب کردہ	چنا ہوا
دریافت	کھوجنا، تحقیق کرنا	منفرد	الگ
رفقا	رفیق کی جمع، دوست	نشست و برخاست	بیٹھنا اُٹھنا
رموز	رمز کی جمع، بھید	نکتہ	چھپی ہوئی اچھی باتیں
روشناس	واقف کار	وثوق	بھروسہ، اعتماد
سبق آموز	نصیحت یا سبق دینے والا	وسط	درمیان
سرِ دست	فی الحال، ابھی	ہجوم	بھیڑ، ازدہام

05.11 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ خاکہ کی تعریف کیجیے۔

سوال نمبر۲ خاکہ اور سوانح کا فرق واضح کیجیے۔

سوال نمبر۳ خاکہ نگاری سے متعلق شرائط و ہدایات بیان کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ خاکہ سے متعلق اہم اجزا کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۲ اُردو خاکہ نگاری کی روایات پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۳ موضوع اور مواد سے متعلق اپنا اظہارِ خیال سپرد قرطاس کیجیے۔

05.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ دید و دریافت از نثاراحمد فاروقی

۲۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ از پروفیسر شمیم حنفی

۳۔ اُردو کے بہترین شخصی خاکے از مبین مرزا

۴۔ مت سہل ہمیں جانو، ممبئی از انورظہیر خاں

٭

اکائی 06 : اُردو کے اہم خاکہ نگار

ساخت

06.01 : اغراض ومقاصد

06.02 : تمہید

06.03 : مرزافرحت اللہ بیگ کے حالاتِ زندگی

06.04 : مرزافرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری

06.05 : مولوی عبدالحق کے حالاتِ زندگی

06.06 : مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری

06.07 : رشیداحمد صدّیقی کے حالاتِ زندگی

06.08 : رشیداحمد صدّیقی کی خاکہ نگاری

06.09 : مجتبیٰ حسین کے حالاتِ زندگی

06.10 : مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری

06.11 : خلاصہ

06.12 : فرہنگ

06.13 : سوالات

06.14 : حوالہ جاتی کتب

06.01 اغراض ومقاصد

آپ کے نصاب میں خاکہ نگاری کوشامل کرنے کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ آپ اُردو کی دیگر نثری اصناف کی طرح خاکہ نگاری سے بھی بخوبی واقف ہوسکیں۔دیگر اصناف کی طرح خاکہ نگاری بھی ایک اہم صنف ہے۔اس لئے اُردو کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاکہ کے تعلق سے اچھّی طرح واقفیت رکھتا ہو۔

اس سے قبل کی اکائی میں خاکہ نگاری کے فن اور خاکہ نگاری کے روایت سے متعلق بخوبی پڑھ چکے ہیں البتہ اس اکائی میں آپ کو خاکہ نگاری کے چند اہم خاکہ نگاروں کے تعارف اوران کے حالات زندگی سے روبرو کرائیں گے۔ساتھ ہی ان کی خاکہ نگاری کی خصوصیات پرتبصرہ کرتے ہوئے کسی خاص مجموعے کوپیشِ نظر رکھنے کی کوشش کریں گے۔

06.02 تمہید

خاکہ نگاری اردوادب کی ایک خاص صنف قرار پائی ہے۔خاکہ نگاری کی باضابطہ ابتداءاردوادب میں بیسویں صدی کے دوسرے یا تیسرے عشرے سے ہوتی ہے۔اردو میں خاکہ نگاری کے اوّلین نقوش خطوطِ غالب،نذیراحمد کے ناول،رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاداور تذکروں خصوصاً محمدحسین آزادکی آبِ حیات میں مل جاتے ہیں۔خاکہ نگاری کی اصطلاح ہمارے یہاں انگریزی ادب سے ہوکرآئی ہے۔ اس کے بعد سے ہی اس کواردوکی اہم ادبی اصناف میں شمار کیا جانے لگا۔مرزافرحت اللہ بیگ وہ شخصیت ہیں جن سے باقاعدہ خاکہ نگاری کا آغاز ہواہے۔ اس کے بعد کے لکھنے والے دیگرحضرات مثلاً مولوی عبدالحق،رشیداحمدصدیقی،عصمت چغتائی،عظیم بیگ چغتائی،شوکت تھانوی،سعادت حسن منٹو،کنھیّالال کپور،مشتاق احمد یوسفی اور یوسف ناظم،مجتبیٰ حسین وغیرہ سنجیدہ اورمزاحیہ خاکہ نگاروں میں اپناایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ان میں سے ہم چندخاکہ نگاروں پرمختصر گفتگوکریں گے۔

06.03 مرزافرحت اللہ بیگ کے حالاتِ زندگی

مرزافرحت اللہ بیگ کی پیدائش دہلی کے محلّہ چوڑی والان میں دل کشا منزل میں ہوئی تھی۔بعض محقّقین کے مطابق وہ راجاسیتل داس کی حویلی میں پیدا ہوئے تھے۔عزیز واقارب کے مطابق اُن کی ولادت ۱۸۸۳ء میں ہوئی تھی۔سروس ریکارڈ میں تاریخ پیدائش ۱۹رنومبر ۱۹۸۵ءدرج ہے۔سیّدوزارت حُسین نے اپنی کتاب ''مصنّفینِ اُردو'' میں اُن کی ولادت کا سال ۱۸۸۶ءتحریرکیا ہے۔اُن کی پیدائش کے تعلّق سے تذکرہ نویس اورمحقّقین کی منفردآراہیں۔حاصل کلام یہ ہے کہ مرزا کی تاریخِ پیدائش میں اختلاف ہے۔مرزا کے مورثِ اعلیٰ ترک نسل سے تھے۔ان کا اصل وطن ختن اورآبائی پیشہ سپہ گری تھا۔اُنھوں نے ایک عرصہ تک بدخشاں میں حکومت بھی کی تھی۔ جب حالات تبدیل ہوئے تو اُن کے جداعلیٰ نے شاہ عالم ثانی (۱۷۰۶ءتا۱۷۷۱ء) کے دَور میں بدخشاں سے ہندکارُخ کیا بھرت پورآئے اوربھرت پور میں ایک فریق کی جانب سے جنگ میں بھی حصّہ لیااورمہم سرکرنے میں اُس کا ساتھ دیا تھا۔فتح حاصل کرنے کے کچھ دنوں کے بعدوہ سفرکرتے ہوئے دہلی پہنچے۔ پھر ہمیشہ کے لئے دہلی کواپنامستقر بنالیااوریہیں سکونت اختیارکی۔

مرزافرحت اللہ بیگ کے والد کا نام مرزاحشمت اللہ بیگ اوروالدہ کا نام مشرّف جہاں بیگم ہے۔مرزاابھی دَس دن ہی کے تھے کہ اُن کی والدہ کی وفات ہوگئی تھی۔والدہ کے انتقال کے بعداُن کی پھوپھی حسن جہاں بیگم نے اُن کی پرورش کی جوکہ انتہائی ضعیف تھیں۔اُن کی بزرگی اورعمرکا اندازہ اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے بھائی مرزاحشمت اللہ بیگ یعنی مرزافرحت اللہ بیگ کے والدکی بھی پرورش کی تھی۔پھوپھی نے مرزا کی پرورش کے ساتھ اُن کی تعلیم وتربیت کا بھی خاص خیال رکھا۔اُنھوں نے اپنی پھوپھی کی پرورش وپرداخت اورمحبت وشفقت کا اعتراف مضامینِ فرحت حصّۂ دوم میں اس طرح کیا ہے:

> ''بے چاری پھوپھی نے پالنے میں ماں سے زیادہ محبت دکھائی۔یہاں تک کہ مجھے بارہ پندرہ برس کی عمرتک یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ یہ میری ماں نہیں پھوپھی ہیں۔''

جب مرزا کی عمرچارسال کی ہوئی تب اُن کی پھوپھی اُنھیں حصولِ تعلیم کی غرض سے بغدادی صاحب کے پاس لے گئیں جواُس وقت حضرتِ نظام الدّین اولیاءکی درگاہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔جب بغدادی صاحب کومعلوم ہوا کہ ابھی تک مرزا کی

بسم اللہ بھی نہیں ہوئی ہے تو اُنھوں نے اپنی جیبِ خاص سے گیارہ آنے کی شیرینی منگوائی، فاتحہ پڑھی اور مرزا کو بسم اللہ پڑھائی۔ اس کے بعد مدرسہ کے بچّوں میں مٹھائی تقسیم کرادی۔

مرزا کی ابتدائی تعلیم روایتی طریقہ پر ہوئی۔ وہ فوقانیہ جماعتوں میں ہمیشہ اوّل یا دوم مقام حاصل کرتے تھے۔ جب اُن کی عمر نو سال کی ہوئی تو اُن کا داخلہ درجہ سوئم میں دہلی کے ایک پرائمری اسکول میں کرادیا گیا جو محلّہ شاہ جی کے چھتّہ میں واقع تھا۔ اس کے بعد اُنھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اُنھوں نے ۱۹۰۱ء میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہندو کالج دہلی میں داخلہ لیا جو کناری بازار میں نیا نیا قائم ہوا تھا۔ انٹرنس کے امتحان میں امتیازی نمبر حاصل کرنے پر اُنھیں نقرئی تمغہ اور سندِ توصیف سے نوازا گیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے ۱۹۰۳ء میں سینٹ اسٹیفن کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۵ء میں بی.اے کی سند حاصل کی۔ پھر اُنھوں نے ایم.اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے اسی کالج میں داخلہ لیا مگر بعض وجوہات اور بالخصوص معاشی حالت اچھی نہ ہونے کے سبب مزید تعلیم حاصل کرنے کے سلسلہ کو منقطع کردیا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے والد لااُبالی قسم کے انسان تھے۔ ''یادگارِ فرحت'' میں ہے کہ ایک بار نذیر احمد سے انھوں نے کچھ روپیہ قرض لینے چاہے لیکن نذیر احمد نے کافی سود طلب کیا جس وجہ سے یہ کام نہ ہوسکا نتیجے میں مرزا فرحت اللہ بیگ کو ملازمت کرنی پڑی اور وہ اسی لئے ملازمت کی غرض سے حیدرآباد آگئے اور ساری زندگی یہیں رہے۔ وقتاً فوقتاً ان کا دہلی آنا جانا ہوتا رہا۔ اس وقت دہلی بڑی تیزی سے بدل رہی تھی جس کا ان کو شدید احساس تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک مضمون ''نئی دہلی'' رقم کیا جس سے ان کے دِلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ حیدرآباد اسکول میں وہ ہیڈ ماسٹر ہوگئے لیکن بعد میں پیشہ بدل گیا اور سیشن جج کے عہدے تک پہنچے۔ اس حیثیت سے وہ گلبرگہ میں رہے۔ یہاں ان کی طبیعت اور مزاج دونوں میں تبدیلی آگئی اور مذہبی رنگ چڑھ گیا۔ اپنی ۶۴/ سالہ زندگی کے ۲۴/ سال دلّی اور ۴۰/ سال حیدرآباد میں گزارے۔ آپ کی تصانیف میں سات مجموعے علاوہ اس کے کچھ نگارشات بھی ہیں۔ سارے مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے لیکن ان کی ایک کتاب ''میری داستان''، ۳۰/ سال بعد شائع ہوئی جس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ حیدرآباد میں خوش نہیں تھے بلکہ ایک قید با مشقّت کی زندگی گزارتے رہے۔ بالآخر اَجل کا پروانہ جب تک آیا تب تک آپ کی عمرِ فانی کی ۶۴/ بہاروں کا سفر کرچکی تھی۔ ۲۷/ اپریل ۱۹۴۷ء کو مرزا فرحت اللہ بیگ حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال کرگئے۔

06.04 مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری

مرزا فرحت اللہ بیگ اُردو کے پہلے خاکہ نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ نے اُردو میں شخصی خاکہ نگاری کو ایک مستقل صنف کے درجہ پر پہنچایا۔ آپ کے پہلے خاکے کا نام ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' ہے۔ جو خاکہ نگاری کا ایک نادر نمونہ اور عقیدت و حقیقت کا ایک خوشگوار مرقّع ہے۔ اس میں ان کا ظریفانہ اُسلوب، ان کے مخصوص ٹکسالی محاوروں اور فقروں سے مزین اور بصد احترام خاکہ کے لیے ایک جاندار سلیقے کا ایسا نادر و نایاب نمونہ موجود ہے جو کہ پھر کسی اور سے نہیں ہوسکا۔ یہ خاکہ پہلی بار اُردو زبان کے مشہور رسالہ'' اُردو'' اورنگ آباد میں جولائی ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اگرچہ اس خاکہ میں کچھ خامیاں بھی ہیں لیکن اُنھیں اس لئے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ اس سے پہلے اُردو میں خاکہ نگاری کا کوئی مکمّل نمونہ موجود نہ تھا۔ پھر بھی اس میں تقریباً وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک عمدہ خاکہ میں ہونا

چاہئے۔ اگر چہ یہ خاکہ بہ اعتبارِ ہیئت سوانحی مضمون یا مختصر سوانح عمری جیسا معلوم ہوتا ہے مگر اس میں نہ تو سوانح عمری جیسی طوالت ہے اور نہ واقعات و جزئیات جیسی ترتیب و تفصیل ہے بلکہ زندگی کی متحرک تصویریں ضرور نظر آتی ہیں جس کے سبب اسے خاکہ کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ یہ خاکہ مولوی نذیر احمد کی زندگی اور شخصیت کا بہترین مرقّع ہے۔

خاکہ نگاری کی پہلی شرط غیر جانب داری ہے۔ اس لئے مرزا فرحت اللہ بیگ کے لئے مولوی نذیر احمد کا خاکہ لکھنا آسان نہ تھا کیوں کہ مولوی نذیر احمد اُن کے اُستاد تھے۔ عقیدت و احترام کے جذبات کے باوجود اُنھوں نے غیر جانب دار ہو کر ایسا خاکہ قلم بند کیا جو اپنی نظیر آپ ہے۔ اُنھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں مولوی نذیر احمد کے حالاتِ زندگی، اخلاق و عادات، اندازِ گفتگو، وضع قطع، حلیہ و لباس، پڑھنے پڑھانے کے انداز اور شب و روز کی مصروفیت ہی کی نہ صرف عکّاسی کی ہے بلکہ خلوص و ہمدردی کے ساتھ اُن کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی آشکار کیا ہے مگر اپنے مزاحیہ اندازِ نگارش کے سبب محاسن کے بجائے معائب کو کچھ زیادہ ہی اُجاگر کیا ہے۔ اُن کے اندازِ نگارش نے مولوی نذیر احمد کی زندگی کے دھندلے نقوش کو اس طرح مجسّم کر دیا ہے کہ صورت و سیرت کے ساتھ اُن کی جیتی جاگتی تصویر نظروں کے سامنے متحرک ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کا ایک اور خاکہ ''ایک وصیّت کی تعمیل'' جو کہ مولوی وحید الدّین سلیم کا ہے۔ اس خاکہ میں بھی وہ تمام خصوصیات ہیں جو ایک عمدہ خاکہ میں ہونی چاہئے لیکن مرزا نے اس خاکہ کو اُس انہماک سے نہیں لکھا ہے جس اِنہماک سے مولوی نذیر احمد کا خاکہ تخلیق کیا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ خاکہ اُنھوں نے خود مولوی وحید الدّین سلیم کی فرمائش کی تعمیل میں لکھا تھا۔ لہٰذا اس میں اُس فطری ذوق و شوق کا فقدان ہے جو مولوی نذیر احمد کے خاکے میں ہے۔ دوسرے یہ کہ اُنھیں مولوی وحید الدّین سلیم سے اتنی قربت حاصل نہ ہو سکی جتنی مولوی نذیر احمد سے رہی تھی۔ مرزا کی ملاقات ہی اُس وقت ہوئی تھی جب مولوی وحید الدّین سلیم ضعیف ہو گئے تھے لہٰذا اُنھیں وہ مواقع میسّر نہیں ہو سکے جن کی مدد سے وہ اس خاکہ میں دلکش رنگ بھر سکتے۔ یہ خاکہ اگر چہ مولوی نذیر احمد کے خاکہ سے مختصر اور کم درجہ کا ضرور ہے تاہم خاکہ نگاری کے جملہ اوصاف سے بھر پور ہے۔ مولوی وحید الدّین سلیم کے روز مرّہ کے احوال، ان کی جزرسی اور تلخ گوئی اور علم و فضل کی ایک نادر تصویر پیش کرتا ہے جس کی بنا پر مولوی وحید الدّین سلیم اب تو اس خاکہ کی بدولت یا پھر اپنی وضع کردہ اصطلاحات اور بے مثل ترجموں کے باعث جانے جاتے ہیں۔ مرا فرحت اللہ بیگ کا اُسلوب گنجلک نہیں آپ اپنی تحریر کو بوجھل نہیں بناتے اور نہ ہی خواہ مخواہ ایسی ادبی روش اختیار کرتے ہیں کہ جسے غایتِ علمی کہا جائے۔ مجموعی اعتبار سے ان کی تحریروں میں دل کشی پائی جاتی ہے۔ دِلّی کی ٹکسالی زبان پر فطری طور پر ان کو قدرت حاصل ہے۔ ان کی تحریروں سے ان کے عہد کے دِلّی کے خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ مذکورہ خاکوں کے علاوہ لالہ سری رام، خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان مرحوم، حکیم آغا خاں عیش، نوّاب عبدالرحمٰن خاں احسانؔ، یادِ ایّام، عشرتِ فانی، العظمۃ اللہ وغیرہ کا شمار اُن کے بہترین خاکوں میں کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بعض خاکے گمنام شخصیتوں پر بھی ہیں جیسے نانی چندر یار، دیور بیگمان خرد ہیں۔

06.05 مولوی عبدالحق کے حالاتِ زندگی

مولوی عبدالحق کی پیدائش ہاپوڑ (اُتر پردیش) کے قریب سرادہ نام کی ایک چھوٹی سی بستی میں ۱۸۷۰ء میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام شیخ علی حسین تھا جو ۱۸۸۵ء میں اِس عالمِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اس وقت عبدالحق کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔ سراوہ گاؤں یا ہاپوڑ میں اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھیں فیروز پور (پنجاب) منتقل ہونا پڑا۔ جہاں آپ نے مڈل تک تعلیم پائی اس کے بعد ۱۸۸۸ء میں

وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے علی گڑھ آ گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸رسال کی تھی۔ علی گڑھ آنے کے بعد جاننے اور سیکھنے کی تڑپ میں شدّت پیدا ہوگئی۔ علی گڑھ آہستہ آہستہ تعلیم کا بہت اہم مرکز بنتا جارہا تھا۔ آپ نے ۱۸۹۳ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔

آپ نے اس کے بعد ۱۸۹۴ء میں بی.اے پاس کیا اور پھر یہیں سے ایم.اے ہوئے۔ تب وہ محسن الملک کے پرائیویٹ سیکریٹری ہو گئے اور بمبئی چلے آئے۔ لیکن یہاں زیادہ عرصے تک قیام نہ ہوسکا۔ بعد ازاں حیدرآباد میں ''افسر'' کی ادارت کی، اردو لغت کی تیاری ان کے سپرد کی گئی۔ ترجمے کے کام پر مامور ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ کی بنیاد سازی میں بھی ان کی مساعی کا خاص دخل رہا۔ دکن کی سرزمین انھیں اِس قدر راس آئی کہ انھوں نے عمرِ عزیز کا ایک بڑا دَور وہاں گزار دیا۔ عبدالحق کی ذہن سازی جس طور پر سرسید و شبلی کے ذریعے ہوئی تھی اسی نے اُنھیں ایک ایسے صاحبِ عمل کردار میں بدل دیا جس کا مقصدِ حیات صرف اور صرف اردو کی ترویج و اشاعت کو مختص ہو کر رہ گیا۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے تحت انجمن ترقی اردو ۱۹۰۲ء میں قائم ہوئی جس کے پہلے معتمد کے طور پر شبلی نعمانی مقرر ہوئے۔ ان کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور پھر عزیز مرزا۔ چوتھے معتمد کے طور پر ۱۹۱۲ء میں عبدالحق کا جب تقرر ہوا تو انجمن کی سست رفتاری میں تیزی آ گئی۔ مولوی عبدالحق اورنگ آباد میں محکمۂ تعلیمات میں سرگرم کار تھے۔ ۱۹۲۴ء میں گورنمنٹ کالج میں پرنسپل کے عہدے پر ان کا تقرر ہوگیا۔ ۱۹۲۹ء میں سبک دوش ہونے کے بعد ۱۹۳۰ء جامعہ عثمانیہ میں اردو کے استاد ہوئے۔ انھوں نے اورنگ آباد ہی میں انجمن کا دفتر قائم کیا اور ۱۹۲۹ء تک یہیں خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں دِلّی میں انجمن کے ساتھ منتقل ہو گئے۔ آزادی کے بعد کراچی چلے گئے جہاں آخر تک اس سے وابستہ رہے۔ مولوی عبدالحق نے اردو زبان کی ترقّی و تحفّظ کے لیے اپنے آپ کو پوری طرح وقف کر دیا تھا۔ ان کی غیر معمولی خدمات کے پیشِ نظر اُنھیں ''بابائے اردو'' کے اعزاز سے بھی سرفراز کیا گیا، جس کے وہ مستحق تھے۔ عبدالحق پاکستان میں بھی آخر عمر تک اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں رہے۔ آزادی کے بعد ان کا سارا وقت کراچی میں گزرا لیکن آخری وقت میں انھیں ہندوستان چھوڑنے کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ بالآخر ۱۶راگست ۱۹۶۱ء کا سورج طلوع ہوا تو وہیں اردو ادب کا یہ سورج کراچی میں غروب ہو گیا۔

06.06 مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری

مولوی عبدالحق کا نام اردو زبان و ادب کی تاریخ و اشاعت میں نہایت نمایاں ہے۔ اُنھوں نے اپنی پوری زندگی اردو زبان و ادب کو ثروت مند بنانے، ترقّی دینے اور تحفّظ فراہم کرنے کرانے کے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ جب تک زندہ رہے ان ہی خطوط پر کام کرتے رہے۔ مولوی عبدالحق نے جملہ ادبی، تحقیقی و تنقیدی خدمات کے علاوہ خاکہ نگاری کے میدان میں بھی اپنا نقشِ دوام قائم کیا اور آج آپ ایک کامیاب خاکہ نگار کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں جانے جاتے ہیں۔ آپ نے ایک ایسے وقت میں جب کہ اردو میں خاکہ نگاری کا فن نہ تو ترقّی یافتہ تھا اور نہ ہی اس کی رفتار تسلّی بخش تھی، تب آپ نے اس صنف پر توجہ فرمائی اور اسے اپنی نگارش سے مقبول بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ آپ کے خاکوں کا مشہور مجموعہ ''چند ہم عصر'' کے نام سے ۱۹۳۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں ۲۴رشخصیات پر لکھے خاکے موجود ہیں۔

آپ نے یہ خاکے عام طور سے بڑی شخصیات کے انتقال کے بعد لکھے۔ مولوی صاحب نے جن بڑی شخصیتوں کا خاکہ کھینچا ہے وہ عموماً اپنے میدان میں بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں اور مولوی صاحب کے مراسم اکثر سے عقیدت مندانہ اور گہرے رہے ہیں۔ آپ نے نہ تو ان خاکوں میں ممدوح کی بے جا تعریف و توصیف کی ہے اور نہ ہی لعن وطعن سے کام لیا ہے بلکہ بڑی حقیقت پسندانہ انداز میں شخصیت کے

مرقع پیش کیے ہیں۔ وہ کسی شخصیت کی خوبیاں یا خامیاں بیان کرتے وقت اعتدال سے کام لیتے ہیں۔ آپ نہ تو خوبیاں بیان کرتے وقت زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں اور نہ ہی برائیوں کا ذکر کرتے وقت بے جا طنز و تعریض کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ نہ ہی زبان چٹخارے دار بناتے ہیں اور نہ ہی دوستی اور مراسم کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں اور نہ ہی وہ کسی شخصیت کے مقام و مرتبہ سے مرعوب نظر آتے ہیں۔ جس شخص میں جو اُنھیں خامی نظر آتی ہے اسے بلا تکلّف کہہ دیتے ہیں۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ شخصیت کی سچّی اور مکمل انسانی تصویر ہوتی ہے اور جسے وہ انتہائی سادہ زبان اور غیر مقفّٰی عبارت میں رقم کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں اس خوبی کی وجہ سے سلاست اور روانی پیدا ہوتی ہے۔ ان کا بے ساختہ پن ان کی نثر کو موثر بناتا ہے۔ ان کے خاکے ادھورے اور نامکمّل نہیں ہوتے۔ نہ ہی وہ کسی شخصیت کی آدھی تصویر اُبھارتے ہیں بلکہ ان کے قلم سے بنائی گئی لفظی اور قلمی تصویریں مکمّل اور جاذب ہوتی ہے۔ ان کے خاکوں کا اصلی وصف جامعیت ہی ہے۔

''چند ہم عصر'' مولوی صاحب کے لکھے ہوئے ان شخصیات کے خاکوں کا مجموعہ ہے جن سے وہ بخوبی واقف ہی نہیں متاثر بھی تھے یا جن کی زندگی کے بعض واقعات، بعض پہلو انھیں لائق توجہ محسوس ہوئے تھے۔ ظاہر ہے مرقع نگاری یا شخصیت نگاری سوانح نہیں ہوتی بلکہ مصنف کی یادوں کا ایک ایسا مجموعہ ہوتی ہے جس میں محض اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ تاریخی تسلسل، سوانحی تاریخیں، تجزیاتی تفصیلات سے عموماً گریز اختیار کر کے محض ان چیزوں کو اختصار کے ساتھ نمایاں کر کے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو دوسروں کے لیے بھی دل چسپ، توجہ طلب اور بعض صورتوں میں حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے محض رہن سہن، عادات و خصائل، طور طریقوں کی طرف اشارہ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا بلکہ انسان کو داخلی طور پر بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ انھیں شخصیات کے مرقع بنائے جن سے وہ پوری طرح واقف تھے اور جن کا مشاہدہ آپ نے بہت قریب سے کیا تھا۔ جب نصیر الدین ہاشمی نے سرور جنگ کے بارے میں خاکہ لکھنے کی فرمائش کی تو مولوی صاحب نے انہیں جواب میں لکھا کہ:

> ''میں نے کبھی ایسے شخص کے متعلق کچھ نہیں لکھا جس کے حالات و خصائل اور سیرت سے مجھے پوری واقفیت نہ ہو میں نے سرور جنگ کو دیکھا ضروری ہے مگر ذاتی طور پر ان کے حالات وغیرہ سے ناواقف ہوں۔''

مولوی صاحب نے جن حضرات پر خاکے لکھے وہ اپنے دَور کی اہم شخصیات تھے۔ مثلاً سید محمود، مولوی چراغ علی، وحید الدین سلیم، محسن الملک، مولانا محمد علی، حالی اور دوسری اہم شخصیات ہیں اس کے علاوہ معمولی حیثیت والے ''نام دیو مالی اور نور خاں'' ہیں۔ مولوی صاحب کی نظر میں انسان اپنے نام نہاد درجے اور طبقے سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ اس کی شناخت اس کے کردار کے خصائص سے ہوتی ہے۔ یہ چیز انھیں ''نور خاں'' کے یہاں نظر آئی جسے وہ صداقت شعاری، حق گوئی اور ایثار کا مجموعہ کہتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں وہ انتہائی ذمہ دار، محنت پسند اور فرض شناس شخص ہے۔ مولوی صاحب نے انسان شناسی کا جو پیمانہ بنایا ہے نور خان اس پر پورا اُترتا ہے۔ ''نور خاں'' جیسے حق گو اور صداقت شعار شخص کی سیرت کو بھی انھوں نے نمایاں کرنا ضروری خیال کیا۔ جو عبدالحق صاحب کی وسعتِ قلبی اور وسیع النظری کا مظہر ہے۔

یہ خاکے ۱۹۳۷ء کے آس پاس یا قبل تحریر کیے گئے تھے لیکن باوجود اس کے ان کی زبان شبلی کی طرح رنگین اور مولانا ابوالکلام کی طرح معرّب اور مفرّس نہیں بلکہ سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔ مولوی صاحب اپنے خاکوں میں اپنی علمیت کا مظاہرہ نہیں کرتے اور نہ ہی زبان دانی کا

مظاہرہ ان کا مقصد رہا ہے۔ بلکہ وہ تو شخصیتوں کی تصویر کو زندہ اور متحرک بنانے کے لیے حسبِ حال سادہ الفاظ وتراکیب کا استعمال کرتے ہیں اور دل چسپ اور مؤثر مرقع تراشتے ہیں۔روز مرّہ اور محاورے سے ٹھیک اسی طرح کام لیتے ہیں جس طرح میرامن نے لیا تھا۔محاوروں کے استعمال میں نذیر احمد کے بجائے میرامن کے مقلّد نظر آتے ہیں۔نامانوس اور مشکل الفاظ سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔انھوں نے اپنے خاکوں میں شعری زبان اور شعری لوازمات (تشبیہ،استعارے) وغیرہ کا استعمال کم کیا ہے اور اگر کہیں کیا ہے تو اس سے ان کی نثر میں ایک طرح کی جاذبیت اور شگفتگی پیدا ہوگئی ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ مولوی عبدالحق کے خاکے کامیاب،موثر اور دل چسپ ہیں۔خصوصی طور پر کامیاب اور مشہور خاکے ''نام دیو مالی''اور''نور خاں''ہیں۔ان کے تحریر کردہ خاکوں سے شخصیت کے پوشیدہ گوشے نہ صرف روشن ہوئے ہیں بلکہ انھیں سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ان کے خاکوں کی مدد سے شخصیتوں کے اخلاق وآداب،اطوار وکردار،نفسیات ورجحانات،عقائد ونظریات کو سمجھنے اور جاننے میں آسانی ہوتی ہے۔ان خاکوں کی مدد سے شخصیات کی داخلی وخارجی گرہیں کھلتی نظر آتی ہیں اور کوئی بھی شخصیت تمام وکمال انداز میں ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ان خاکوں میں ایک طرح کی سبق آموزی ہے یہی وہ خوبیاں ہیں جو مولوی عبدالحق کے خاکوں میں پائی جاتی ہیں۔

06.07 رشید احمد صدّیقی کے حالاتِ زندگی

رشید احمد صدّیقی کی ولادت ۱۸۹۶ء میں مڑیاہوں ضلع جونپور میں ہوئی تھی۔حضرت پیر ذکریّا رشید صاحب کے جدّ اعلیٰ تھے۔وہ سترہویں صدی عیسویں میں دینِ اسلام کی تبلیغ کی غرض سے ترک سے آئے تھے۔شروع میں پنجاب میں قیام کیا بعد میں جونپور آگئے اور مڑیاہوں میں مکمل طور پر رہائش اختیار کی۔ان کی اولادمیں اکثر وبیشتر فوجی تھے۔یہی رشید صاحب کے اسلاف میں تھے۔ان کے والد کا نام عبدالقدیر تھا یہ بھی محکمۂ پولیس سے وابستہ تھے اور ایک وقت تک ملیار اور غازی پور میں رہے۔عبدالقدیر کی نیک نامی اور دیانت داری مشہور تھی۔نماز وروزہ کے پابند تھے۔مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے مرید تھے۔عبدالقدیر کی شادی سید باسط علی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ان سے ۴ لڑکے اور ۳ لڑکیاں تھیں۔رشید احمد صدیقی چوتھی اولاد تھے۔عبدالقدیر جب بیریا ضلع بلیا میں تھے تو وہیں رشید احمد صدیقی پیدا ہوئے۔بچپن میں بے حد لاغر وکمزور تھے۔مختلف امراض میں مبتلا رہے۔اسی بنا پر وقت پر تعلیم نہ ہوسکی۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔آپ نے فارسی کے علاوہ عربی کے بھی چند رسالے پڑھے۔پھر اردو حساب کی طرف مائل ہوئے۔اس کے بعد مقامی پرائمری اسکول میں داخل کر دیے گئے۔یہاں سے فارغ ہونے کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول جونپور میں داخلہ لے لیا۔یہاں سے انھوں نے ۱۹۱۴ء میں میٹرک پاس کیا۔معاشی طور پر گھر کے حالات اچھے نہیں رہے اس لئے مزید تعلیم کا امکان کم ہوگیا اور پھر نوکری کی تلاش میں رہے۔

شروع میں جونپور کی عدالت میں کلرک مقرر ہوئے۔تھوڑے دنوں ملازمت کی پھر ۱۹۱۵ء میں علی گڑھ آگئے ۱۹۱۹ء میں انھوں نے بی.اے کیا اور ۱۹۲۱ء میں ایم.اے کیا۔اس وقت علی گڑھ کالج الہ آباد یونیورسٹی ملحق تھا۔۱۹۲۱ء میں ان کا تقرر عارضی طور پر اردو پڑھانے کے لیے تین ماہ کے لئے ہوا۔یہ عہدہ اردو مولوی کہلاتا تھا۔اردو لکچرر کی جگہ جب نکلی تب یہ بھی امیدوار ہوئے اور عارضی طور پر لکچرر ہوگئے۔۱۹۲۶ء میں مستقل لکچرر کر دیئے گئے ۹ رسال بعد ریڈر اور پھر ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔۱۹۵۸ء میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنی ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ان کی تصنیف وتالیف کے سلسلے میں انھیں''پدم شری''کے

اعزاز سے ۱۹۶۳ء میں نوازا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ ۱۹۷۳ء میں یوپی اردو اکادمی سے بھی ایک امتیازی انعام ملا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ہمیشہ علیل رہتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس کے ۱۵؍جنوری ۱۹۷۷ء میں ان کی طبیعت مزید خراب ہوئی اور اسی دن ہی تین بجے سہ پہر کو اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ ۱۶؍جنوری ۱۹۷۷ء کو رشید احمد صدیقی کو مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

06.08 رشید احمد صدّیقی کی خاکہ نگاری

رشید احمد صدیقی طالب علمی کے زمانہ ہی سے انشاپردازی کے میدان میں اپنے جوہر دکھانے لگے تھے۔ اُنھیں اُردو طنز و مزاح کی روایت میں نہ صرف منفرد و ممتاز مقام حاصل ہے بلکہ وہ اس میدان میں روایت کی حیثیت بھی اختیار کر چکے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں جس طرح کی بے ساختگی اور برجستگی پائی جاتی ہیں اُس کی مثالیں کہیں اور نہیں ملتی۔ اُن کی تحریروں میں مزاح کی چاشنی اور لطافت کے ساتھ ساتھ طنز کی تیز دھار بھی نظر آتی ہے۔ دراصل اُنھوں نے طنز و مزاح کو باضابطہ ایک صنف کی حیثیت سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے یہاں طنز و مزاح کے ساتھ سنجیدگی، متانت اور ادبی جاذبیت کا پوری طرح التزام پایا جاتا ہے۔ وہ پھکّڑ پن اور عامیانہ مذاق کو پسند نہیں کرتے۔ اُن کے طنز میں کہیں طعن و تشنیع اور ہزل جیسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اُن کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے۔ اُن کی تحریروں میں جا بجا مخصوص واقعات اور لطیف اشارے پائے جاتے ہیں۔ اُن کی بیشتر نگارشات معیار و وقار کا بہترین نمونہ ہیں جن سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے تاریخ و سیاسیات وغیرہ سے واقفیت اور ادبی ذوق کا میلان ہونا لازمی ہے۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک فن کے ذریعہ محض افراد کی دل بستگی کا سامان نہیں کیا جانا چاہئے بلکہ معاشرے کی ناہمواری اور منفی رویّوں کو اُجاگر کر کے معاشرے کی اصلاح کرنے اور صحت مند قدروں کو قائم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ خود رشید احمد صدّیقی لکھتے ہیں:

> ''طنز وظرافت کسی کی آبروریزی یا اپنی نالائقی کی تسکین کے لئے نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح وارتقا کے لئے ہوتی ہے۔''

رشید احمد صدّیقی کا شمار اُردو خاکہ نگاری کے معماروں میں کیا جاتا ہے۔ ''گنج ہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' اُن کی خاکہ نگاری کے اہم شاہکار ہیں۔ ''ہمارے ذاکر صاحب'' بھی اُن کا ایک طویل خاکہ اور بعض دوسری تحریروں میں اقبال سہیل کا خاکہ خاص طور سے اہم ہے اور اردو خاکہ نگاری کو ان کی دین ہے۔ ''گنج ہائے گراں مایہ'' میں سولہ خاکے شامل ہیں جو بالترتیب مولانا محمد علی، ڈاکٹر مختار انصاری، مولانا سید سلیمان اشرف، مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی، اصغر حسین گونڈوی، محمد ایوّب عباسی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولانا احسن مارہروی، سید محفوظ علی بدایونی، سید نصیر الدین علوی، سید سجاد حیدر یلدرم، سر شاہ سلیمان، شیخ حسن عبداللہ، جگر مرادآبادی، بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد پر لکھے گئے ہیں۔

''ہم نفسانِ رفتہ'' میں چھ خاکے شامل ہیں جو بالرتیب شفیق الرحمٰن قدوائی، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبدالحق، نواب محمد اسمٰعیل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری اور کندن کے ہیں۔ ''ہمارے ذاکر صاحب'' میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان خاکوں میں جو چیز خاص طور سے اپنی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ شرافت، وضع داری اور معقولیت کا پروفیسر رشید احمد صدیقی کا اپنا معیار و وقار ہے۔ چناں چہ ایک جگہ انھوں نے خود لکھا ہے:

''میں اس دوست کے سقائم وفضائل پر مرتا ہوں نہ کہ اس کے اقتدار واختیار پر اس لئے کہ اثر واقتدار حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں یا جن کو سخت مذموم طریقوں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے یا جن کے حصول میں محض اتفاق کو دخل ہو سکتا ہے لیکن فضائل نفس وہ نعمت ہے جو صرف خدا کے برگزیدہ بندوں کو ملتی ہے۔''

(بیسویں صدی میں اردو ادب، ص:۳۹۵، گوپی چند نارنگ)

مضامینِ رشید، آشفتہ بیانی میری، شیخ نیازی اور خنداں میں بھی چند بہترین خاکوں کی شمولیت ہے۔ وہ اپنے خاکوں کے آغاز ہی میں ایسے پُر معنی اور چونکا دینے والے جملے تحریر کرتے ہیں کہ قاری اُنھیں شروع سے آخر تک پڑھنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ چند خاکوں کے ابتدائی کلمات آپ کی تفنّنِ طبع کے لئے بطورِ مثال پیش خدمت ہیں:

☆ ولادت تو مادر زاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی مَوت خانہ زاد تھی۔

☆ سیّد نصیر الدّین علوی مرحوم ہنستے کھیلتے زندہ رہے اور ہنستے کھیلتے ہی اُٹھ گئے۔ آغاز اور انجام دونوں قابلِ رشک۔

☆ جگر صاحب وہاں پہنچ گئے جہاں ایک نہ ایک دن ہر اُس متنفس کو پہنچنا ہے جو زندگی کے مرض الموت میں گرفتار ہے۔ اس دنیا میں مَوت بھی کتنی سستی، یقینی، ہر جگہ، ہر وقت آسانی سے مل جانے والی چیز ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہَوا، پانی، آگ اور مٹّی کی طرح یہ بھی ہر جاندار کے لئے کتنی ضروری ہے۔

06.09 مجتبیٰ حسین کے حالاتِ زندگی

مجتبیٰ حسین کی پیدائش ۱۵ / جولائی ۱۹۳۶ء چینچولی نامی تحصیل میں ہوئی جو کہ ضلع گلبرگہ کے تحت ہے اس وقت یہ ریاستِ حیدر آباد کا ضلع تھا لیکن ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی لسانی تقسیم کے بعد کرناٹک کا ایک ضلع ہو گیا۔ آپ کے والدِ گرامی کا نام مولوی محمد حسین تھا۔ آپ کے اسلاف کا پیشہ سپہ گری تھا۔ ضلع عثمان آباد کے باشندے تھے اور عثمان آباد میں پیش کار کے عہدے پر تعینات رہے۔ اس کے بعد آپ کا تبادلہ گلبرگہ ہو گیا۔ آپ کی نوکری کا زیادہ عرصہ گلبرگہ میں ہی گزرا جہاں آپ تحصیل دار کے منصب پر فائز تھے۔ مولوی محمد حسین علمی وادبی ذوق کے حامل کی ایک اعلیٰ شخصیت تھے۔ مجتبیٰ حسین کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اس کے بعد مدرسہ تحتانیہ آصف گنج گلبرگہ میں داخل ہوئے۔ تائیدو (آندھرا پردیش) سے میٹرک پاس کیا۔ گلبرگہ انٹر میڈیٹ کالج سے ۱۹۵۳ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد سے بی.اے مکمّل کیا اسی زمانے میں آپ نے ایوننگ کالج حیدر آباد سے ڈپلوما ان پبلک ایڈمنسٹریشن کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ مجتبیٰ حسین کو والد گرامی کی ملازمت کی وجہ سے اکثر و بیشتر ہاسٹلوں میں رہنا پڑا۔ ہاسٹل کے اندر جہاں کچھ سہولیات ہوتی ہیں تو وہیں کچھ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ کچھ زحمتیں ہوتی ہیں تو کچھ رحمتیں بھی ہوتی ہیں۔

سب سے پہلے تو انسان میں خود شناسی کا جو ہر پیدا ہوتا ہے، قوّتِ فیصلہ ترقّی پذیر ہوتی ہے اور اپنی صلاحیتوں کو جاننے، اُبھارنے اور منوانے کے موقع فراہم ہوتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے لیے اقامت خانوں نے کسوٹی کا کام کیا۔ ان کی شخصیت میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو صیقل کر کے زیرِ آبدار بنا دیا۔ مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور تحریروں میں جو بلا کی خود اعتمادی اور اور خود احتسابی صاف نظر آتی ہے وہ ان کے زمانۂ طالبِ علمی کی دین ہے۔ تعلیمی زمانہ گلبرگہ کا ہو یا عثمانیہ کا ہر جگہ آپ نے دوستوں کی ایک دنیا آباد کر رکھی تھی۔

۱۹۵۶ء میں مجتبیٰ حسین کی شادی اپنی چچازاد بہن ناصرہ رئیس سے ہوگئی۔ روزنامہ ''سیاست'' سے وابستہ ہوئے گویا یہاں سے صحافتی زندگی کا آغاز تھا لیکن ۱۹۶۲ء میں آندھرا پردیش کے محکمۂ اطلاعات اور تعلقات عامہ میں ملازمت کی۔ ۱۹۷۲ء میں گجرال کمیٹی کی تشکیل ہوئی تو حکومتِ ہند نے اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کی غرض سے آپ کو شعبۂ ریسرچ میں کام کرنے کے لئے بلوایا گیا۔ پھر آپ شعبۂ ریسرچ سے وابستہ ہو گئے۔ جب یہ کام مکمّل ہوا تو ۱۹/ستمبر ۱۹۷۴ء کو نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCERT) میں پبلی کیشن ڈیپارٹمنٹ میں شعبۂ اردو کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

مجتبیٰ حسین شروع سے ہی متحرک وفعّال شخصیت رہے۔ مختلف اداروں اور انجمنوں کے اہم عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ ۱۹۷۸ء میں وہ زندہ دِلانِ حیدرآباد کے سکریٹری بھی رہے۔ ''ماہنامہ ''شگوفہ، آج کل، یوجنا'' وغیرہ سے بھی وابستہ رہے۔ کاؤنسل برائے فروغ اردو کے ایک رکن بھی ہوئے اور کئی دوسرے اداروں سے وابستہ ہو کر اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ ۱۹۸۰ء میں آپ جاپان گئے۔ ۱۹۸۴ء میں آپ نے لندن اور پیرس کا سفر کیا، نیویارک، واشنگٹن، شکاگو، کناڈا، سوویت یونین کے کئی علاقے مثلاً تاشقند، سمرقند، بخارا اور ماسکو ازبکستان کی سیاحت کی۔ سعودی عرب کے مقدس مقامات کی بھی زیارت کی۔ ۱۹۸۹ء میں پاکستان بھی گئے۔ اور ۱۹۹۳ء میں اسی کونسل سے وظیفہ پر سبک دوش ہوئے۔ لیکن مختلف رسالوں میں کالم نویسی کرتے رہے۔ ان کی مختلف موضوعات کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور انھیں مختلف ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے جن میں ''غالب ایوارڈ''، ''مخدوم ایوارڈ''، ''کنور مہدی سنگھ ایوارڈ'' اور ''میر تقی میر ایوارڈ'' وغیرہ جیسے کئی ایوارڈ شامل ہیں۔ مذکورہ ایوراڈ کے علاوہ حکومت ہند نے انھیں ۲۰۰۷ء میں ''پدم شری'' جیسے ایوراڈ سے نوازا اور اسی سلسلے میں ان کی طویل خدمات کے اعتراف میں گلبرگہ یونیورسٹی کرناٹک نے انھیں ۲۰۱۰ء میں ''ڈاکٹریٹ'' کی اعزازی ڈگری دی۔

06.10 مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری

مجتبیٰ حسین نے صنف خاکہ نگاری کے میدان میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کے خاکوں کے بارے میں ان کی خود یہ رائے بھی بڑا وزن اور معیار و وقار رکھتی ہے کہ:

''جس طرح دل و دماغ نے کسی شخصیت کو قبول کیا اسے ہو بہو کاغذ پر منتقل کر دیا۔''

یہی وہ خاصیت ہے جو ان کے خاکوں میں نظر آتی ہے۔ آپ نے جن شخصیات پر خاکے لکھے ہیں ان کے پیشہ جات، دل چسپیاں اور مشاغل ومعمولات مختلف طرح کے ہیں۔ ان میں ادیب، شاعر، نقاد، افسانہ نگار، محقق، مصوّر، کلرک وعہدہ دار، شیخ و برہمن، ڈاکٹر و حکیم، محتسب و مے نوش وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام میں جو قدرِ مشترک چیز ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب مجتبیٰ کے دوست ہے۔ ''قصۂ مختصر'' میں اپنی دوستی کے تعلّق سے ایک جگہ یوں بیان کرتے ہیں:

''میں دوستوں کا رسیا اور متوالا ہوں اپنے وقت کا بڑا حصہ دوستوں میں گنواتا ہوں۔''

مذکورہ قول کا بیّن ثبوت مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری سے صاف عیاں ہے۔ ان کی دوستی ایک سالم شخص سے ہے جس میں اس کی خوبیاں اور خامیاں دونوں شامل ہیں۔ ان کی دوستی میں بے غرضی، خلوص اور محبت کا دریا موجزن معلوم ہوتا ہے اسی لیے وہ اپنے دوستوں کی کمزوریوں سے بھی ویسا ہی پیار کرتے ہیں جیسا کہ ان خوبیوں سے کرتے ہیں۔ صاحب خاکہ کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا ذکر کچھ اس بے ساختگی اور

والہانہ انداز سے کرتے ہیں کہ قاری بھی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر بھی مسکرانے لگتا ہے۔خاکہ نگار کو یہ احساس ہے کہ ''کسی کی جسمانی ساخت کا مذاق اُڑانا اچھے مزاح کا شیوہ نہیں''۔اچھی خاکہ نویسی کا تقاضا یہ ہے کہ جس شخص کا بھی خاکہ ہو اس کے تعارف میں کوئی کمی باقی نہ رہ جائے۔

مجتبیٰ حسین کو واقعہ نگاری اور مرقّع کشی میں کمال حاصل ہے۔مجتبیٰ حسین کی تشبیہوں واستعاروں میں بڑی تازگی اور انفرادیت ہے۔ ان کی تشبیہات موضوع سے مناسبت رکھتی ہیں۔مجتبیٰ حسین لفظوں کے اچھے پارکھی بھی ہیں۔انھیں ذومعنی الفاظ کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے کا ہنر آتا ہے۔کبھی لفظی تکرار سے مزاح کو نئی معنوی جہت عطا کرتے ہیں اور کبھی محاوروں کے استعمال بھی قاری کو عجیب وغریب لطف سے جاتا ہے۔کبھی کبھی وہ الفاظ ومحاورات سے اس طرح اٹھکھیلیاں کرتے ہیں کہ ضلع جگت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔مجتبیٰ اشاروں اور کنایوں میں ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ جس کی تفصیل کے کئی صفحات درکار ہوتے ہیں اس میں شائستگی ہوتی ہے نفاست سے کئی اَن کہی باتوں کو کہہ جاتے ہیں۔اس لیے ان کے خاکے حیرت واستعجاب کے ماحول میں غرق رہتے ہیں۔تحریف نگاری سے عموماً طنز ومزاح نگاروں نے بہت فائدہ اُٹھایا ہے اس میدان میں وہی مزاح نگار قدم رکھ سکتا ہے جو کہ ادب کا صاف ستھرا ذوق رکھتا ہو اور اس کا مطالعہ وسیع ہو۔مجتبیٰ نے جملوں، مصرعوں، شعروں اور فقروں میں تحریف وترمیم کر کے بڑا لطف پیدا کر دیتے ہیں۔مجتبیٰ حسین کسی شخصیت کا خاکہ لکھتے وقت اس کی نمایاں خصوصیات کو اپنا مرکزی موضوع بنا لیتے ہیں اور اسی کے خیال کے اطراف میں تانے بانے بن کر مجموعی خاکہ تیار کر دیتے ہیں چناں چہ آدمی نامہ کی فہرست میں صاحب خاکہ کا نام لکھ کر اس کا بنیادی وصف بھی لکھ دیا ہے مثلاً:

''کنہیا لال کپور: لمبا آدمی، مخدوم محی الدین: یادوں میں بسا آدمی، ابراہیم جلیس: اپنا آدمی، خواجہ عبدالغفور: لطیفوں کا آدمی وغیرہ...

مجتبیٰ حسین خاکوں کی ایک خوبی یہ بھی کہ وہ اپنے مزاحیہ انداز سے خاکہ نویسی میں ایک افسانوی اور ڈرامائی تکنیک سے کام لیتے ہیں اور واقعات اور لطیفوں کا ایک سلسلہ قائم کرتے چلے جاتے ہیں جو کہ قاری کو ایک پل بھی نظر ہٹانے نہیں دیتا۔اس کی عمدہ مثالیں ان کے مضامین ''اردو کا آخری قاری''، ''ریل منتری مسافر بن گئے''، ''ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے'' وغیرہ اور ''آدمی نامہ'' کے خاکوں میں خواجہ عبدالغفور، رضا نقوی واہی، مخدوم محی الدین اور مخمور سعیدی میں دستیاب ہیں۔مجتبیٰ حسین کے خاکے جہاں ہم کو ہنساتے ہیں تو وہیں ہماری تہذیبی شکست و ریخت، ادبی ولسانی زبوں حالی پر رُلاتے بھی ہیں۔

''چہرہ در چہرہ'' میں ایک عجیب وغریب خاکہ ''اپنی یاد میں'' کئی جگہ قاری کو درد و کسک میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔مجتبیٰ حسین کے خاکے صرف طنز وتبسم والی چیز نہیں فکر وآگہی کا ایک دفتر بھی ہیں جس میں قاری اپنی شناخت بھی کر سکتا ہے اور زمانے کے اُلٹ پھیر کو سمجھ سکتا ہے۔''چہرہ در چہرہ'' کے ابتدا ''دو باتیں'' میں آپ نے ایک بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ ''میں احباب کے اکثر خاکے خود اپنا خاکہ لکھنے کی چاہ میں لکھے ہیں۔حقیقت خواہ یہ ہو نہ ہو تب بھی مجتبیٰ ہر خاکہ میں خود اس طرح ہیں کہ ''صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں'' والی کیفیت رکھتے ہیں۔ان کی زندگی، ان کا فن، ان کا طرزِ زندگی، ان کے مشاہدات وتجربات سب کچھ ان خاکوں میں رچ بس گئے ہیں۔بڑا کمال یہ ہے خاکوں سے اگر مجتبیٰ حسین کو نکال دیا جائے تو خاکہ بے رنگ ونور ہو جائے۔جس طرح مجتبیٰ حسین کے ذکرِ خیر کے بغیر خاکہ مکمّل نہیں ہوتا اسی طرح حیدرآباد کے تذکرے کے بغیر مجتبیٰ حسین ادھورے نظر آتے ہیں۔حیدرآباد ان کی طاقت بھی ہے اور ان کی کمزوری

بھی۔مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ خاکوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں اوّل: آدمی نامہ ۱۹۸۱ء، دوم: سو ہے وہ بھی آدمی ۱۹۸۷ء، سوم: چہرہ در چہرہ ۱۹۹۴ء، ہوئے ہم دوست جس کے ۱۹۹۹ء شائع ہو چکے ہیں۔علاوہ اس کے مجتبیٰ حسین نے مختلف موضوعات خامہ فرسائی کی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے کالم نویسی کے توسّل سے طنز و مزاح کے میدان میں قدم رکھا۔آپ نے اکثر خاکے اپنے دوست واحباب کی فرمائش یا اصرار پر اور مختلف مواقع اور تعزیتی مجالس کے لیے لکھے۔پہلا خاکہ آپ نے اپنے ایک بزرگ دوست حکیم یوسف حسین خاں کی خواہش پر ان کے شعری مجموعہ ''خوابِ زُلیخا'' کی تقریب رسمِ اجرا میں پڑھنے کے لیے ۱۹۶۸ء میں تحریر کیا تھا جسے صاحبِ خاکہ اور سامعینِ خاکہ دونوں نے بہت سراہا۔ آپ کی خاکہ نگاری کے سفر میں یہی خاکہ نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

- ☆ ''آدمی نامہ'' میں ۱۵ رخاکے شامل ہیں۔
- ☆ ''سو ہے وہ بھی آدمی'' میں ۱۴ رخاکے شامل ہیں۔
- ☆ ''چہرہ در چہرہ'' میں ۲۰ رخاکے شامل ہیں۔
- ☆ ''ہوئے ہم دوست جس کے'' میں ۱۷ رخاکے شامل ہیں۔
- ☆ ''بہترین تحریریں'' کے عنوان سے دوسری جلد میں حسن چشتی نے ان کی کتابوں اور مختلف رسالوں میں شائع شدہ خاکوں سے اکتالیس خاکے منتخب کر کے ۲۰۰۲ء میں شائع کروائے ہیں۔یہاں پر ہم صرف ''آدمی نامہ'' کے مجموعہ کے تعلق سے تبصرہ کریں گے۔

مجموعہ ''آدمی نامہ'' نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم آدمی نامہ سے لیا گیا ہے۔جس میں نظیر نے آدمی کی مختلف حیثیتوں کا تعین کر دیا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے خاکوں کے اس مجموعہ میں اپنے موضوع سے متعلق شخصیت کی ہر سطح کو ایک ماہر مصوّر، ایک بے جوڑ کارٹونسٹ کی طرح جانچا اور پرکھا ہے۔مجتبیٰ حسین کے شوخ و چلبلی فطرت نے اچھے خاصے سنجیدہ آدمی میں بھی مزاح کا پہلو تلاش کر لیا ہے۔اور کمال یہ ہے کہ یہ خلاف فطرت بات صاحبِ خاکہ پر بھی بالکل فطری انداز میں چسپاں ہو جاتی ہے۔آدمی نامہ میں صرف ایک ایسا خاکہ ہے جس میں مجتبیٰ کی دل گدازی، اندرونی کرب اور جذبہ کی متانت، جذبات کی شدّت پر حاوی معلوم ہوتی ہے۔اور وہ خاکہ ابراہیم جلیس کا ہے۔جہاں مجتبیٰ حسین بھی سنجیدہ جذبات نگاری پر قدرت رکھنے کا بھی اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔آدمی نامہ کے خاکوں میں تناسب و توازن ہیں نہ بہت اختصار نہ بہت طویل ہیں لیکن قاری پھر بھی ان خاکوں میں کسی اشیا کی کمی محسوس نہیں کرتا ہے۔خاکہ نگاری میں یہ بھی ایک طرح کا ہنر ہے۔اکثر مجتبیٰ حسین ان ہی شخصیات پر خاکے لکھے ہیں جن سے ان کی قربت زیادہ رہی ہے۔خاکہ نگاری میں زیادہ قربت اکثر بڑی مصیبت بھی بن جاتی ہے لیکن آدمی نامہ میں مجتبیٰ حسین نے بڑی فنکارانہ چابک دستی سے خاکوں کی تراش خراش کی ہے۔خاکوں میں مجتبیٰ حسین نے صاحبِ خاکہ سے تعارف کا پورا سامان جمع کر دیا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صاحب خاکہ کی شکل وصورت، اخلاق و عادات، وضع قطع، گفتار و کردار، رہن سہن، لباس وغیرہ کے طور و طریق مکمّل مجتبیٰ حسین کی پکڑ میں ہیں ان ہی میں سے چنندہ واقعات یا باتوں کو جب چاہیں تحریری شکل کی صورت میں صفحات پر ثبت کر دیتے ہیں۔اگر چہ ان میں بے ربطی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود بھی اس بے ربطی میں ایک طرح کا منطقی ربط و تسلسل بھی موجود ہوتا ہے جو زیادہ تر مجتبیٰ حسین کے اُسلوب کی خود ساختہ پیداوار ہے۔

عام طور پر آدمی کو اپنی شعوری غیر شعوری حرکات وسکنات کا احساس نہیں ہوتا، مگر خاکہ نگار ان اوصاف کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن مجتبیٰ حسین تو ایسی باتوں کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ خود موضوعِ خاکہ کے لیے اس کی اپنی کمزوری فرحت وانبساط کا باعث بن جاتی ہے اور قاری کی مسکراہٹ کا سامان موجود ہو جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کا دائرئ احباب جتنا وسیع ہے اتنا ہی ان کے تجربات ومشاہدات کا سلسلہ طویل ہے اور انسانی نفسیات کا بہت گہرا مطالعہ ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شاعر یا فنکار اپنے فن یا شعر کی تعریف سننے میں کس قدر جلد باز ہوتا ہے۔ بظاہر وہ اپنے آپ کو تعریف وتوصیف سے بے نیاز ظاہر کرتا ہے لیکن یہ بے نیازی بے وجہ نہیں ہوتی۔ اس کے پیچھے آرزومندی چھپی رہتی ہے۔ مخدوم ایک بہت بڑے شاعر اور بہت اچھے انسان بھی تھے۔ اکثر اپنی بات چیت میں کہا کرتے تھے کہ ''ادیب اور شاعر کو اپنے نام اور شہرت سے بے نیاز رہنا چاہیے۔'' مجتبیٰ حسین کو ایک دن شرارت سوجھی اس شرارت کا حال مخدوم کے خاکے میں بڑے ہی دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک مخدوم سے انھوں نے جھوٹ موٹ میں کہہ دیا کہ ان کی ایک نظم دِلّی کے ایک رسالے میں بڑی اہتمام سے چھپی ہے۔ رسالہ کا نام یاد نہیں لیکن عابد روڈ کے بس اسٹینڈ والے بک اسٹال پر ابھی ابھی وہ رسالہ انھوں نے دیکھا ہے۔ مخدوم تھوڑی دیر تک اس خبر سے بے تعلق سے رہے۔ پھر اچانک اُٹھے اور چلے گئے۔ مجتبیٰ حسین جانتے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے، خود بھی اپنے احباب کے ساتھ بک اسٹال پر پہنچے۔ مخدوم وہاں موجود تھے۔ آپ انھیں دیکھ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا ''مخدوم بھائی میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ شاعر اپنے کلام سے کس حد تک بے نیاز رہ سکتا ہے۔'' شاذ تمکنت پر لکھے خاکے میں بھی شاعروں کی اس کمزوری کا خوب مذاق اُڑایا ہے۔

خاکوں میں عالمی مسائل سے لے کر فرد اور سماج کے غیر ذمہ دارانہ رویّوں کے مختلف گوشوں کی نشان دہی میں مجتبیٰ حسین کی دوررس نگاہ کبھی کوتاہی نہیں کرتی ہے۔ ایسے وقت میں بھی وہ فرد سے ماحول کی طرف اور اطراف واکناف سے فرد کی طرف بڑے انہماک سے توجہ دیتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت نہ ان کے قلم پر جھلاّہٹ سوار ہوتی ہے اور نہ ان کی شخصیت مجروح وستم زدہ نظر آتی ہے۔ اپنی گفتگو میں بڑی چستی و پھرتی اور نفاست سے نشتر لگاتے چلے جاتے ہیں۔ زندگی کی کڑواہٹ سے ہی زندگی میں سکون کا سامان مہیّا کراتے نظر آتے ہیں۔ اس خصوصیت کی کئی مثالیں ان کی خاکہ نگاری میں یعنی آدمی نامہ میں دستیاب ہیں۔ فکر تونسوی: بھیڑ کا آدمی، خواجہ عبدالغفور: لطیفوں کا آدمی، اسی اعتبار سے اچھے خاکے ہیں۔ خاکہ لکھتے وقت مجتبیٰ حسین اپنے موضوع کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ چند کلمات میں ہی پوری شخصیت کا خاکہ کھینچ دیتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں اولیت انسان کی اہمیت ہے۔ کیوں کہ وہ انسانی اعلیٰ اقدار کے خواہاں وقدرداں ہیں۔ مجتبیٰ حسین اپنے خاکوں میں بڑے صاف انداز میں اپنی پسندیدہ اقدار کا اظہار کرتے چلے جاتے ہیں۔ دوسری چیز وہ ہے جسے مجتبیٰ حسین شخصیات میں تلاش کرتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں وہ علم وکمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عموماً ایسی شخصیات کو خاکہ نگاری کے چنا ہے جو کسی نہ کسی طرح علم وفن میں ایک اہم مقام کی اہلیت رکھتے ہیں۔ آپ کی خاکوں میں کرخت اور سخت تلفّظ والے الفاظ بہت کم ملتے ہیں۔ ان کے خاکوں میں نرم دھیمے اور دلکش الفاظ اور ان کی خوب صورت تراکیب قاری کو محویت کے عالم میں پہنچا دیتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ مجتبیٰ حسین کے قلم نے کسی ایک میدان کو جولاں نگاہ نہیں بنایا ہے بلکہ آپ نے انشائیہ، خاکہ، سفرنامہ اور کالم نویسی میں اپنی قلم کاری کا ثبوت پیش کیا ہے۔

06.11 خلاصہ

اس اکائی میں اردو کے اہم خاکہ نگاورں میں سے صرف چند خاکہ نگاروں پر مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ، بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مجتبیٰ حسین کے حالات زندگی کو قلم بند کیا گیا ہے اس کے علاوہ ان کی خاکہ نگاری کی خصوصیات کو بھی تحریر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی خاکہ نگاری کے مجموعوں پر سرسری طور پر مختصر تبصرہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سبق کے مطالعے سے یقیناً آپ کے علم میں اضافہ ہوا ہوگا اور آپ خاکہ نگاری پر اپنے علم میں مزید اضافہ کے لئے حوالہ جاتی کی کتب سے فہرست سے دوسری کتابوں کا بھی مطالعہ کرسکیں گے۔

06.12 فرہنگ

آبائی پیشہ	: باپ دادا کا کام کاج	سالم	: مکمل
اَجَل	: موت	سبکدوش	: ریٹائرمینٹ
استعجاب	: تعجب	ستم زدہ	: ستم کرنے والا
اندازِ نثر	: نثر لکھنے کا انداز	سکونت	: رہنے کی جگہ
انہماک	: غور وفکر	شناخت	: پہچان
بے ربطی	: ربط کے بغیر، الگ	عالَمِ فانی	: ختم ہونے والی دنیا
بیّن	: روشن	علیل	: بیمار
پارکھی	: جانچنے والا	فریق	: جماعت
تجربات	: تجربہ کی جمع	قدرداں	: قدر کرنے والا
تراش خراش	: کانٹ چھانٹ	کم درجہ	: کم اہمیت کے حامل
جلد باز	: جلدی کرنے والا	لااُبالی	: غیر ذمّہ دار
خُتَن	: ایک شہر کا نام	مجروح	: زخمی
خواہاں	: چاہنے والا	مزیّن	: سجاوٹ، آرائش
دلکش	: دل کو کھینچنے والا	مُستقر	: ٹھکانہ
راس	: پسند	منقطع	: ختم ہونا
رسیا	: چاہنے والا، لالچی	نادر	: کم یاب

06.13 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ مرزا فرحت اللہ بیگ کی زندگی پر اپنا اظہار خیال پیش کیجیے۔

سوال نمبر۲ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی مختصر سوانح اپنے الفاظ میں لکھیے۔

سوال نمبر۳ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی حیات سے متعلق ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۴ مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری خصوصاً ''آدمی نامہ'' پر اپنی آرا کا اظہار کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری پر اظہارِ خیال پیش کیجیے۔

سوال نمبر۲ مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری پر اپنا موقف سپردِ قرطاس کیجیے۔

سوال نمبر۳ مجتبیٰ حسین کے سوانحی کوائف سے متعلق اپنی گراں قدر معلومات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۴ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری سے متعلق ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

06.14 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری از ڈاکٹر صابرہ سعید

۲۔ آزادی کے بعد دہلی میں اُردو خاکہ نگاری از شمیم حنفی

۳۔ اُردو نثر کا فنّی ارتقا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۴۔ مصنفینِ اُردو از سیّد وزارت حُسین

۵۔ بیسویں صدی میں اردو ادب از گوپی چند نارنگ

۶۔ دید و دریافت از نثار احمد فاروقی

۷۔ مجتبیٰ حسین نمبر از ڈاکٹر خالد حُسین خاں

۸۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق: حیات اور علمی خدمات از شہاب الدین ثاقب

۹۔ مرزا فرحت اللہ بیگ بحیثیت انشائیہ نگار اور خاکہ نگار از ماہ نامہ شگوفہ حیدرآباد

✲

اکائی 07 سفرنامہ کافن

ساخت

07.01 : اغراض ومقاصد

07.02 : تمہید

07.03 : سفرنامے کی تعریف

07.04 : سفرنامے کافن

07.05 : خلاصہ

07.06 : فرہنگ

07.07 : سوالات

07.08 : حوالہ جاتی کتب

07.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ اردو ادب کی غیر افسانوی نثر سے متعلق اہم صنف ''سفرنامہ'' کے فن اوراس سے متعلق سبھی اہم معلومات کو حاصل کرسکیں گے۔

07.02 تمہید

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اردو ادب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

﴿۱﴾ شاعری ﴿۲﴾ نثر

اُردو شاعری کی طرح اردو نثر کی بھی مختلف اصناف ہیں جنھیں دو حصوں یعنی افسانوی نثر اور غیر افسانوی نثر میں بانٹا گیا ہے افسانوی نثر میں داستان ، ناول ، ڈرامہ اور افسانہ وغیرہ اصناف شامل ہیں تو غیر افسانوی نثر کی اصناف میں سوانح ، خط، مضمون، آپ بیتی، انشائیہ، رپورتاژ اور سفرنامہ وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

سفر زندگی کا ایک اہم حصہ ہے جس سے ہر انسان کو واسطہ پڑتا ہے یا ہر انسان سفر کے مراحل سے ضرور گزرتا ہے۔ سفر میں ایک جگہ یا شہر سے دوسری جگہ یا ملک وشہر جانا ہوتا ہے۔ سفر تصوّراتی یا خیالی نہیں ہوتا اس کے لیے جسمانی نقل وحرکت اور عملی تدبیریں ضروری ہیں۔ انسان فطرتاً تنوع پسند واقع ہوا ہے اس لیے وہ یکسانیت، یکساں معمولات یا ایک ہی مقام پر مستقل قیام کرنے سے اکتاہٹ اور بے چینی و بے کیفی محسوس کرتا ہے۔ بے کیفی اور یکسانیت کی یہی کیفیت اسے سفر پر آمادہ کرتی ہے اور وہ نقل مکانی یا سفر پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔

عقل وشعور، تجسّس اور تحیّر خیز شوق اسے نئے جہانوں کی سیر کرنے اور دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور نئی نئی معلومات حاصل کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ سفر کو وسیلۂ ظفر بھی کہا گیا ہے اور نت نئے تجربات حاصل کرنے کا مؤثر ذریعہ بھی کہا گیا ہے۔ سفر کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ تجارتی، سیاسی، تفریحی اور معلوماتی بھی مختصر مدّت کے حامل بھی اور طویل المدّتی بھی۔ نزدیکی بھی اور فاصلے والے بھی، مقامی بھی اور بیرونی بھی، انفرادی بھی اور اجتماعی بھی! سفر کا انسان سے بڑا گہرا اور پرانا رشتہ ہے۔ عالمِ بالا سے آب وگِل تک پہنچنا بھی سفر ہے۔ انسان فطرتاً سیر سپاٹے اور سفر کرنے کا عادی یا شوقین رہا ہے۔

سفر کی اہمیت اور ضرورت کا اعتراف شعرانے بھی کیا ہے۔ مثلاً:

سفر زندگی کے لیے سوز و ساز سفر ہے حقیقت ، حضر ہے مجاز

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

کیوں کہ دنیا سرائے فانی ہے اس لیے انسان کی پوری زندگی کو بھی سفر سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ یہ مسافر خانہ ہے اور ہر انسان ایک مسافر ہے۔ اس لحاظ سے سیاحت یا مسافرت کا انسانی زندگی سے بڑا مضبوط اور گہرا رشتہ قائم ہے۔ اَزَل سے سفر کا سلسلہ جاری ہے اور دنیاوی اور انسانی زندگی کے ارتقا میں سفر اور مراحلِ سفر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مختلف شہروں، ملکوں، خطّوں کی سیاحت وسیر سے نہ صرف نئے نئے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں بلکہ نئے نئے انسانوں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں اور نئی نئی سیاسی، تاریخی، سماجی، جغرافیائی، تجارتی، تہذیبی، تمدنی، ادبی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ زبانوں کو سیکھنے، سمجھنے کے مواقع ملتے ہیں۔ نئے نئے طرزِ معاشرت اور رہن سہن سے واقفیت ہوتی ہے۔ نئے مناظر، نئی فضا، نئے حالات دیکھنے والے یا سفر کرنے والے کو نئی طرزِ فکر سے آشنا کرتے ہیں۔ علم ومعلومات حاصل کر کے اور حقیقی زندگی اور حقیقی انسانوں کو دیکھ کر حیرت ومسرت میں اضافہ ہوتا ہے۔

سفر: عربی زبان میں مسافت طے کرنے کو کہتے ہیں۔ اسلام میں سفر کو کامیابی کا سبب قرار دیا ہے اور 'سیرو فی الارض' کی تلقین کی گئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک سبھی پیغمبروں نے سفر کیے ہیں۔ حج بیت اللہ کی زیارت بھی ایک سفر ہی ہے۔ سفر اس لیے بھی مفید اور ضروری ہے کہ یہ انسان کی جسمانی اور دماغی اعتبار سے متحرک اور بیدار رکھتا ہے اس فکر ونظر میں وسعت پیدا کرتا ہے، اسے زندگی کے نشیب وفراز اور تجربوں سے واقف کراتا ہے۔ اسے بے شمار کامرانیوں اور کامیابیوں سے ہم کنار کر کے انسانی قدر ومنزلت میں اضافہ کرتا ہے۔ سفر انسانی، ترقی، تعمیر، قدرتی مناظر سے واقف کرا کے لطف اندوز کرتا ہے اور بڑے مقاصد کا سبب بنتا ہے۔ انفرادی، قومی، ملکی، اصلاح وترقی کے لیے سفر بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

تحسین فراقی نے ''عجائباتِ فرنگ'' کے مقدمے میں لکھا ہے:

''جہاں تک سیر وسیاحت کے محرکات کا تعلق ہے تو عہد قدیم سے لے کر اب تک تجارت، حصولِ علم و عبرت، تبلیغِ دین، سیاسی مقاصد برآری، تلاشِ معاش اور زیارتِ مقاماتِ مقدّسہ وغیرہ وہ چند مقاصد ہیں جنھوں نے نسلِ انسانی کے پاؤں میں چکّر ڈال رکھا ہے اور یوں ان متنوّع مقاصد کے حامل اسفار نے مختلف سفر ناموں کو جنم دیا ہے جو دیس دیس کی تاریخ، تہذیب، تمدّن، تصوّرِ کائنات، عادات، رسوم، رواج،

رجحانات، معتقدات، میلانات اور علوم کا ایک وسیع خزانہ سمیٹے بیٹھے ہیں اور جو بعض صورتوں میں تاریخ تہذیب وتمدّن کا سب سے اہم اور بنیادی ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔''

سفر کو ان محرکات، اسباب اور مقاصد کے اعتبار سے کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً: مذہبی سفر، تعلیمی سفر، ادبی سفر، تجارتی سفر، تفریحی سفر، سیاسی سفر، جنگی سفر، مہماتی سفر وغیرہ! سفر اور سیاحت میں بنیادی فرق ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اس فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''سیّاح کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ اپنے گھر، وطن، نام اور پیشہ سے منقطع ہوکر کسی غیر مادی شئے کی طرح سبک اور لطیف ہوجاتا ہے اور حد بندیوں کو تج کر ایک آوارہ جھونکے سی آزادروی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مسافر کی حالت تو اس پتنگے کی سی ہے جو مکڑی کے جالے میں قید ہوکر ایک سرے سے دوسرے تک اور ایک منزل سے دوسری منزل تک جالے کی ڈور سے بندھا ہوا بڑھتا چلا جائے لیکن سیاح مکڑی کے جالے سے یکسر آزاد ہے۔ گھر کی دیواریں اور منزل کے دھاگوں سے بھی اسے کوئی سروکار نہیں......سیاح تو اپنا راستہ خود بناتا ہے جبکہ مسافر حرکت کرتے ہوئے بھی حرکت کی نفی کرتا ہے۔''

سفر کی نوعیت کی طرح، سفر کے وسائل بھی مختلف ہوتے ہیں۔ آج کی سائنسی ترقی نے سفر کے کئی ذرائع پیدا کردیے ہیں لیکن ماضی میں سفر کرنا آسان نہ تھا۔ آج پوری دنیا ایک عالمی گاؤں بن گئی ہے اور بحری وبرّی، ہوائی ہر طرح کے سفر کی سہولتیں مہیّا ہیں لیکن ماضی میں یہ آسانیاں مہیّا نہیں تھیں۔ طویل سفر کے لیے طویل مدّت درکار ہوتی تھی۔ ہاتھی، گھوڑا، اونٹ، بیل کی مدد سفر طے کیے جاتے تھے لیکن اب الیکٹرونک ترقیات کے سبب جو سفر مہینوں میں طے ہوتا تھا وہ گھنٹوں میں طے ہونے لگا ہے۔ فاصلے قربتوں میں تبدیل ہوگئے ہیں اسی لیے سفر کرنے کا شوق، مرحلہ اور رجحان بھی عام اور آسان ہوگیا ہے۔ موٹر کار، بس، ریل، ہوائی جہاز، پانی کے جہاز کے سبب سفر کی سہولتیں ہوگئیں ہیں۔ خواہ سفر سے متعلق بے شمار آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں لیکن سفر کے ذرائع ووسائل میں پیروں کی اہمیت ہنوز برقرار ہے۔

سفر سے پورے طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے پیروں سے چلنا اور ہر ہر چیز کے قریب پہنچ کر اس کا مشاہدہ کرنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے سفر اور مسافر کے لیے پیروں کی اہمیت بنی رہے گی۔ یہ صحیح ہے کہ سفر کرنا ہر انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ سفر کے لیے وقت، ساز و سامان اور سرمایہ کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے لیکن اس کے لیے شوق، لگن اور ہمت بھی ضروری ہے جو کہ ہر انسان میں نہیں پائی جاتی۔ وہی لوگ سفر کرتے اور سفر سے لطف اندوز ہوتے ہیں جو سرمایہ کے ساتھ ساتھ ہمّت بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔

سفر میں طرح طرح کی تکالیف اور بے آرامی بھی گوارہ کرنی پڑتی ہے اس لیے بھی ہر انسان اس کا محتمل نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ سفر کرنے کی ہمت اور استعداد نہیں رکھتے یا ان کے حالات، صحت انھیں سفر کرنے کی اجازت نہیں دیتی وہ لوگ سفر کرنے والوں کے تاثرات اور تجربات سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے اندر کے جذبہ اور خواہش کی تسکین کی خاطر وہ سفر کرنے والے افراد سے مکالمہ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور سفرناموں کا مطالعہ کرکے اپنے تشنہ ذوق وشوق کو آسودہ کرتے ہیں۔

عوامی دل چسپی کے ان پہلوؤں اور انسانی فطرت کے مطالبات کے پیشِ نظر سفر کرنے والوں نے اپنے سفر کی روداد تحریر کرنا شروع کی اور اس طرح سفر نامہ کو باقاعدہ طور پر ایک ادبی اور بیانیہ صنف کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ سفر کرنے کی طرح تحریری سفر ناموں کی تاریخ بھی خاصی قدیم ہے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ تاریخ نویسی کے آغاز کے ساتھ ہی سفر نامہ لکھنے کا آغاز ہوا۔ ابتداً لوگوں یا مسافروں نے خوش گوار یادوں، باتوں کو محفوظ رکھنے کی غرض سے انھیں قلم بند کرنا شروع کیا اور پھر آگے چل کر اس روایت نے باقاعدہ طور پر ایک ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر لی۔ دنیا کا پہلا سفر نامہ نگار کون تھا؟ اور اس نے کس زبان میں سفر نامہ تحریر کیا؟ یہ بتانا دشوار ہے۔ البتہ مغربی مؤرخین نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''ہیروڈوٹس'' دنیا کا سب سے پہلا سفر نامہ نگار تھا۔

اردو میں سفر نامہ نگاری کا آغاز اُنیسویں صدی عیسوی میں ہوا اور یوسف خاں کمبل پوش اردو کے پہلے سفر نامہ نگار اور ان کا سفر نامہ ''تاریخِ یوسفی'' معروف بہ ''عجائباتِ فرہنگ'' اردو کا پہلا باقاعدہ سفر نامہ تسلیم کیا گیا ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش نے ۱۸۳۷ء میں انگلستان کا سفر کیا تھا یہ سفر نامہ ۱۸۴۷ء مطبع العلوم دہلی کالج سے شائع ہوا تھا۔ تب سے آج تک اردو ادب میں سیکڑوں سفر نامے لکھے جا چکے ہیں اور ان کا سلسلہ آج بھی جاری بلکہ آئندہ بھی جاری رہنے کے روشن امکانات ہیں۔

اُردو کے ابتدائی دَور میں سفر ناموں کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے ادبی اور لسانی اعتبار سے یہ سفر نامے زیادہ معیاری اور دل چسپ اس لیے نہیں کہ ان میں تاریخی اور جغرافیائی حالات زیادہ ملتے ہیں اور تخلیق کا عنصر کم پایا جاتا ہے۔ پھر بھی کیوں کہ یہ ابتدائی نمونے ہیں اس لیے ان کی اہمیت ہمیشہ قائم رہے گی۔ وقت گزرنے اور باصلاحیت، معروف و مستند ادیبوں کے ذریعے سفر نامے لکھے جانے کے سبب اس صنف میں بتدریج نکھار پیدا ہوتا گیا اور اب یہ صنف یعنی سفر نامے ایک دل چسپ صنفِ ادب کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔

سفر ناموں میں سفر نامہ نگار کی شخصیت اور صلاحیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتا سمجھتا، پرکھتا اور محسوس کرتا ہے یا جن باتوں سے متاثر و محظوظ ہوتا ہے انھیں کو اپنے سفر نامے میں قلم بند کرتا ہے اس اعتبار سے سفر نامہ نگار کی ذات کو سفر نامے سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ خود سفر نامہ نگار بھی، سفر نامے کو اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر سفر ناموں میں کہیں داستان، کہیں ناول، کہیں ڈرامہ اور کہیں افسانے کی کیفیت یا اندازہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا بیانیہ انداز اسے ناول یا افسانے سے قریب تر کر دیتا ہے۔

07.03 سفر نامے کی تعریف

جیسا کہ پچھلے صفحات میں لکھا جا چکا ہے اور آپ جانتے بھی ہیں کہ سفر نامہ اردو کی غیر افسانوی نثر کی ایک اہم، مقبول اور دل چسپ صنفِ ادب ہے یہ ایک بیانیہ صنف ہے جس کے مطالعے سے سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی، علمی، ادبی، جغرافیائی حالات اور معلومات کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ نئے جہانوں کی سَیر ہوتی ہے۔ نئے ملکوں کے انسانوں اور ان کے رہن سہن سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ انسان کے متجسّسانہ ذوق کی تسکین ہوتی ہے اور ذہنی تفریح کے ساتھ ساتھ علمی ادبی لطف و معلومات میں اضافہ ہوتا ہے ادبی سرمائے میں وقعت اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مسافر اپنے سفر سے متعلّق اپنے مشاہدات، تجربات، محسوسات، جذبات، خیالات اور تاثرات کا اظہارِ حقیقی انداز میں ایک خاص ادبی اسلوب میں تحریر کرتا ہے تو اسے ''سفر نامہ'' کہا جاتا ہے۔ سفر نامے کا تمام مواد، مسافر کے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے مناظر، حالات اور

واقعات سے اخذ کیا جاتا ہے۔سفرنامے کے لیے سفرنامہ نگار کا خود سفر کرنا لازمی ہے۔گھر بیٹھے یا سنے سنائے واقعات پر سفرنامہ تحریر نہیں کیا جا سکتا۔سفرنامہ نگار محض کیمرے کی طرح تصویر کشی نہیں کرتا بلکہ اپنے فکر وخیال اور اُسلوب سے جاندار مناظر اور حقیقی واقعات وحالات کی سچّی تصویریں پیش کرتا ہے۔

سفرنامہ نگار ایک بیدار ذہن، حسّاس انسان ہوتا ہے وہ اپنے اطراف کی اشیاء اور مناظر کا بغور مشاہدہ کرتا ہے اور جو کچھ وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے خوشگوار یا ناخوشگوار ردّعمل کے طور پر صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔

بقول ڈاکٹر خالد محمود:

> ''......وہ ظاہری چیزوں کو دیکھ کر اپنے باطن کی آواز بھی سنتا ہے۔اس کے اندر سے نکلنے والی یہی آواز دراصل اس کا احساس، اس کا جذبہ، اس کا تاثّر، اس کا ردّعمل اور اس کی رائے ہوتی ہے جسے وہ علم کی روشنی میں سفرنامے کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔سفرنامہ نگار کا علم جیسا تازہ تجربہ، جیسا وسیع خیال، جیسا نیا اور فن جیسا پختہ ہوتا ہے، سفرنامہ ویسا ہی معتبر، دل چسپ اور معلومات افزا ہوتا جاتا ہے... سفرنامہ نگار اپنے عہد کو جس حالت میں دیکھتا ہے بیان کرتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ حالات بھی بیان کرتا ہے جو اس کے سامنے نہیں ہیں۔وہ اپنے مشاہدے کی قوّت تیز تر کر لیتا ہے اور زندگی کی تمام جہتوں کو کاغذ پر منتقل کر دیتا ہے۔اس پیچیدہ عمل میں پوری کامیابی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب سفرنامہ نگار ادب کے تخلیقی اور فنّی تقاضوں سے واقف ہو اور تجربات و مشاہدات کو جاذبِ توجہ اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔یہ صلاحیت کمزور ہوگی تو گہرے مشاہدات کے باوصف سفرنامہ نگار اچھا سفرنامہ لکھنے سے قاصر رہے گا۔''

(اُردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص۲۲)

07.04 سفرنامے کا فن

سفرنامہ ایک بیانیہ دل چسپ اور معلومات افزا ادبی صنف ہے۔اس کے لیے کسی خاص تکنیک یا خاص اصول اور ضابطہ کی پابندی ضروری نہیں ہے۔جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ سفرنامہ تحریر کرنے کے لیے سفر لازمی شرط ہے۔سفرنامہ نگار کا تجسّس اچھا، مشاہدہ گہرا، حافظہ قوی اور لکھنے کی صلاحیت پختہ ہونی چاہیے تب ہی ایک اچھا سفرنامہ وجود میں آ سکتا ہے۔اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ:

> ''سفرنامہ نگار کا مزاج اور تحریری برتاؤ، سفرنامے کا اصول، اسلوب اور تکنیک قرار پاتا ہے۔''

بعض سفرنامے صرف معلومات فراہم کرنے کا سبب بنتے ہیں لیکن انھیں معیاری ادبی فن پارے سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔بعض سفرناموں پر داستان، ناول یا افسانوں کا گمان ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ ایک اچھے سفرنامے میں مذکورہ بالا تمام خصوصیات شامل ہو سکتی ہیں لیکن سفرنامے کو بہرحال سفرنامہ ہونا چاہیے۔دوسری تمام خوبیاں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ان سے سفرنامے کو پُر از معلومات، تحیر خیز، دل چسپ بنایا جا سکتا ہے لیکن سفرنامے سے سفرنامہ نگار کی حیثیت بہرحال ایک مسافر کی طرح ہے لہٰذا وہ حیثیت ہر حال میں قائم رہنا ضروری ہے۔

سفر نامہ نگار اپنے تجربات و احساسات کو ظاہر کرنے میں کلیتاً آزاد ہوتا ہے وہ جس طرح چاہتا ہے اپنے مشاہدات و تاثرات کو قلم بند کر دیتا ہے لیکن ہر حال میں سفر نامے کو سفر نامہ ہی ہونا چاہیے۔ وہ داستان، ناول، یا افسانہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی یہ انفرادی حیثیت ہی اس کی منفرد شناخت ہے کہ جس سے وہ پہچانا جاتا ہے۔ سفر نامے میں تحیّر خیزی اور دل چسپی اچھی بات ہے لیکن یہ عناصر حقائق پر مبنی اور فطری انداز میں ہونا چاہیے۔ بلا وجہ کی مصنوعیت، رنگین بیانی افسانویت پُر اسراریت یا مبالغہ آمیزی سفر نامے کے فن کے خلاف ہیں۔ اس نوع کی باتوں سے نہ صرف یہ کہ سفر نامے کی روح مجروح ہوتی ہیں بلکہ اس کا معیار و اعتبار بھی متاثر ہوتا ہے۔

فنّی اعتبار سے سفر نامہ ایسی بیانیہ صنف ہے جس میں اُسلوب کے تجربات اور غیر ضروری بیان کی بے جا طوالت کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ کیوں کہ سفر نامہ نگار، سفر نامے میں اپنے نجی مشاہدات و تجربات کو بیان کرتا ہے اسی لیے سفر نامہ میں کہیں کہیں آپ بیتی کا رنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اچھے اور سفر نامے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تخیّل سے کم اور صداقت سے زیادہ کام لیا جائے۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی:

> ''(سفر نامہ نگار) لفظوں کے حوالے سے اپنے باطن میں چھپی ہوئی حقیقتوں کا انکشاف کرتا ہے اور داخل میں وارد ہونے والے ہر تجربے کو لفظوں کی مدد سے جانچتا اور پرکھتا ہے۔ ان تجربات کو محسوس کی سطح پر لانے کے لیے لسانیاتی پیکر ایک نئی کشفی حالت میں دوچار ہوتے ہیں۔ سفر نامے میں ایسے ایک دو نہیں کئی مقام آتے ہیں۔ کبھی یہ سفر خارج سے داخل کا سفر ہے....... یا پھر داخل سے خارج کا سفر۔''

(معاصر، ص۵۹۹)

ایک کامیاب، دل چسپ اور اچھے سفر نامے میں سفر سے متعلق سبھی ضروری باتوں، واقعات کا ذکر جتنا ضروری ہے اس کا دل چسپ اُسلوب اور ادبی حسن بھی اسی قدر لازمی ہے۔ یعنی سفر نامہ نگار جو کچھ لکھے اس میں ادبیت ہونا چاہیے۔ ورنہ سفر نامہ محض خبر، رپورٹ یا اطلاع و معلومات کا پلندہ بن جائے گا۔ ادبی معیار اور قاری کی دل چسپی برقرار رکھنے لے لیے ادبی حُسن اور اُسلوب کی چاشنی کامیاب سفر نامے کی پہچان ہے۔ واقعات کے اظہار میں سفر نامہ نگار زبان و بیان سے کام لیتا ہے لہٰذا اس کا اُسلوب ایسا دل چسپ اور پُر اثر ہونا چاہیے کہ جو ہر پڑھنے والے کو بار بار پڑھنے اور لطف اندوز ہونے پر آمادہ کر سکے۔ وہ مناظر اور واقعات کو اس طرح بیان کرے کہ اس کی تصاویر پڑھنے والے کی آنکھوں میں گھوم جائے یا وہ خود کو بھی ایسا محسوس کرے گو یا وہ سفر نامے کی تحریر میں درج مناظر کو اپنی آنکھوں سے حقیقی روپ میں دیکھ رہا ہے۔ جو تاثر، جو لطف، سفر نامہ نگار نے محسوس کیا ہے ویسا ہی پڑھنے والے کو بھی محسوس ہو، یہی اچھے اور کامیاب سفر نامے کی مثال کہی جاسکتی ہے اور اسی سے سفر نامہ نگار اور اس کے سفر نامے کو مقبولیت حاصل ہوسکتی ہے۔ اردو کے بڑے ادیبوں کے سفر نامے اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرح اپنے طرز اسلوب کو اپنے سفر کو ایک ادبی فن پارہ بنا دیا ہے۔ ایسے سفر نامے تاریخ ادب میں ہمیشہ مقبول رہتے ہیں۔ انھیں معلومات کا خزانہ ہی نہیں تاریخی اور ادبی سرمایہ بھی سمجھا جاتا ہے۔

اگر ہم سفر نامہ نگار کا ادیب ہونا یا ہر ادیب کا سفر نامہ نگار ہونا ضروری نہیں ہے۔ کئی ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض سفر نامہ نگار نے اپنے سفر ناموں سے قبل کوئی ادبی کتاب تصنیف نہیں کی تھی۔ لیکن جب سفر نامے لکھے تو ناقدین اور قارئین ان کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ جس طرح

دیکھنااور محسوس کر کے رائے قائم کرنا ایک فن ہے اسی حاصل شدہ تاثر کو دل چسپ انداز میں صحیح ترتیب کے ساتھ تحریر کرنا بھی ایک آرٹ ہے۔ جن سفرنامہ نگاروں نے اس آرٹ سے کام لیا ہے وہ کامیاب ہو گئے ہیں اور جو ایسا نہیں کر سکے ہیں ان کے سفرنامے اور وہ خود تاریخِ ادب میں کوئی منفرد یا اہم مقام حاصل نہیں کر سکے ہیں۔

مرزا حامد بیگ کا یہ خیال درست ہے:

''سیاحت کے ثمرات اور تجربات اپنا انعام آپ ہیں اس لیے سفرناموں کا بیان بھی منہ بسورنے اور آہ وزاری کرنے کا محتمل نہیں ہوسکتا۔تخلیقی سفرناموں کی شگفتہ بیانی راضی بہ رضا ہونے کی علامت ہے۔فطری سیّاح اپنے منتخب کردہ پرصعوبت سفر کے مال پر راضی بہ رضا ہی ہوتا ہے سو طے پایا کہ اس کے لیے شگفتہ اور سبک انداز تحریر مناسب ہے لیکن نہ اتنا کہ پھکڑّ بازی کے حدود کو چھونے لگے۔''

(اُردو سفرنامے کی مختصر تاریخ)

سفرنامہ میں شامل ہر بات صحیح نہیں ہوتی۔سفرنامہ نگار اپنے نجی مشاہدات سے رائے قائم کرتا ہے وہ محقق یا تاریخ داں نہیں ہوتا۔اس لیے اس کی بیان کردہ ہر بات سچّی ہو یہ ضروری نہیں ہے۔

علامہ شبلی نعمانی ایک کامیاب اور ذمے دار مؤرّخ بھی تھے اور اچھے سفرنامہ نگار بھی! انھوں نے اس پہلو کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس طرح اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے:

''سفرنامہ اگرچہ تاریخی سلسلے کا ایک دل چسپ حصہ ہے اسی قدر غلطیوں کے احتمالات سے مملو ہے..... ایک بڑی غلطی جو عموماً سفرنامہ لکھنے والوں سے ہوتی ہے جزئیات سے کلیات کا قائم کرنا ہے۔سفر میں انسان کو جن اشخاص سابقہ سے پڑتا ہے وہ ان کے اخلاق وعادات اور خیالات کے توسّط سے تمام قوم کی نسبت عام رائے قائم کر لیتا ہے حالاں کہ ممکن ہے وہ اُمور انھیں چند اشخاص کے مخصوص ہوں۔اسی طرح ہر واقعے سے وہ ایک عام نتیجہ نکالنا چاہتا ہے اور واقعے کے خاص اسباب کی جستجو میں نہ وہ اپنا وقت صَرف کرنا چاہتا ہے نہ اس کو اس قدر فرصت مل سکتی ہے۔ غلطی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ جو شخص کسی ملک کا سفر کرتا ہے وہ پہنچ کر اوّل اوّل جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے وہ محض سرسری ہوتا ہے اور چوں کہ ایسی اجمالی واقفیت استنباطِ نتائج کے لیے کافی نہیں ہوتی اوہ وہ نتیجے کے قائم کرنے میں دیر تک انتظار نہیں کر سکتا اس لیے وہ ہر واقعہ کے ساتھ قیاسات کو دخل دیتا جاتا ہے۔ان قیاسات کے وقت وہ حُسنِ ظن یا سوئے ظن جو پہلے سے اس کے دل میں موجود تھا، چپ کے چپ کے اپنا کام کرتا اور اس کو خبر تک نہیں ہوتی۔''

(سفرنامہ مصر وشام وروم، ص۵تا۶)

سفرنامہ اس لیے تحریر کیا جاتا ہے تاکہ سفرنامہ نگار اپنے مشاہدات وتجربات کو قلم بند کر کے محفوظ کر دے اور وہ قاری کو اپنی خوشیوں میں شریک کر سکے لیکن سفرنامہ نگار کی یہ کوشش اسی وقت بارآور ثابت ہوتی ہے جبکہ سفرنامہ نگار اپنی بات پوری دل چسپی ،سچائی اور سلیقے کے ساتھ

پیش کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو سفر نامہ بے جان، غیر دل چسپ اور بے تکلّف ہوکر رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ سفر نامہ کوئی تاریخی یا تحقیقی تصنیف یا دستاویز نہیں ہوتا اس لیے تاریخی یا جغرافیائی حالات کو پیش کرنا نہ تو اس کا مقصد ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے یہ توقع رکھنی چاہیے۔

اس سلسلے میں انور سدید کی یہ رائے درست ہے:

''سفر نامہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں مشاہدے کی قوت سب سے زیادہ روبہ عمل آتی ہے۔ یہ صنف علمِ تاریخ اور علمِ جغرافیہ کے فنّی مقاصد کے لیے میکانکی انداز میں کوائف جمع نہیں کرتی بلکہ ایک مربوط دل چسپ اور خوشگوار بیانیہ مرتب کرنے کے لیے ان سب سے فائدہ ضرور اُٹھاتی ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے اور زندگی اس مشاہدے کو سفر نامے میں یوں منتقل کردیتا ہے کہ آنے والا اس دَور کی روح کا تحرک محسوس کرلیتا ہے اور اس میں مکمّل کامیابی اس وقت ہوتی ہے جب سفر نامہ نگار ادب کے جملہ تقاضوں سے بخوبی واقف ہو اور مشاہدے کو تخلیقی انداز میں پیش کرنی کی قوّت رکھتا ہو۔''

(اُردو ادب میں سفر نامہ، ص:۵۹)

اسی بات کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

''ایک کامیاب سفر نامہ وہ ہوتا ہے جو صرف ساکت وجامد فطرت کا عکاس نہ ہو بلکہ لمحہِ رواں میں آنکھ، کان، زبان اور احساس سے ٹکرانے والی ہر شئے نظر میں سما جانے والی ہو۔ تماشہ، نغمہ ونکہت کا ہر صوت ورنگ لفظوں کی امیجری میں جمع ہوکر بیان کو مرقّع بہار بنادے اور قاری ان تماشوں میں جذب ہوکر خود کو اس مرکّب آئینہ گری کا حصہ بنائے۔''

مرزا ادیب کا خیال ہے:

''سفر نامہ نگاری لازماً ایک تخلیقی تجربہ ہے، اس کا اطلاق انھیں معنوں پر ہوتا ہے جو تخلیقی تجربے سے وابستہ کیے جاتے ہیں۔''

اس سلسلے میں مشفق خواجہ روایتی اور غیر روایتی سفر ناموں کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''روایتی سفر نامہ ہمیں مقامات سفر سے متعارف کراتا ہے اور غیر روایتی سفر نامہ کیفیات سفر سے۔ مقامات سفر کی تفصیل لکھنے والا زمان ومکان کا اَسیر ہوتا ہے جبکہ کیفیات سفر قلم بند کرنے والا زمان ومکان سے ہٹ کر بھی سوچتا ہے اور یہی چیز اس کے سفر نامہ کو معلومات کا گنجینہ بننے سے بچاتی ہے اور اس کا رشتہ ادب سے قائم کرتی ہے۔''

(دیباچہ: موسموں کا عکس، ص۱۰)

سفر نامہ کی تعریف، فن اور خصوصیات سے متعلق مرزا حامد بیگ کی یہ رائے بہت مناسب ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''خارج سے متعلق بیانیہ اصناف ادب میں سفر نامہ سرفہرست ہے لیکن شاید سفر نامہ واحد صنف اظہار ہے جس کی تکنیکی تعریف کا تعین تا حال ممکن نہیں ہو سکا، کچھ یہی سبب ہے کہ سفر نامہ کبھی روزنامچے کی رنگ میں

لکھا گیا اور کبھی خطوط کی شکل میں۔ اس میں مکالمے کی شمولیت بھی ممکن ہے اور اس میں خبر پہنچانے کا انداز بھی کھپ جاتا ہے۔ پیشِ منظر کا سفر نامہ اُسلوبی سطح پر ''نان فکشن'' رہتے ہوئے بھی فکشن کا انداز اختیار کر گیا ہے البتہ سفر نامے میں پیش آنے والے واقعات فکشن کی طرح ترتیبِ نو کے محتمل نہیں ہوتے اور جہاں کہیں بھی ایسا کیا گیا...... سفر نامہ، ناول یا افسانہ بن گیا، سفر نامہ نہیں رہا..... مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سفر نامہ ادب کی ایک مستقل بیانیہ صنف ہے جس میں خارجی مشاہدے کو تخیّل پر فوقیت حاصل ہے۔ البتہ سفر سے متعلّق ہونے کے باعث سفر نامے میں تحیّر کا عنصر نمایاں تر ہے۔ لیکن یاد رہے کہ مستقل ادبی صنف ہونے کے ناطے سفر نامے کی پیشکش ادبی نوع کی ہوگی نہ صرف مسافر کا بیان۔''

(اُردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، ص، ۹-۱۰)

آخر میں ایک اچھے اور کامیاب سفر نامے کی خصوصیات سے متعلق ظہیر احمد صدیقی کی یہ رائے پیش کی جاتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

''اچھا سفر نامہ وہ ہے جس میں داستان کی سی داستان طرازی، ناول کی سی فسانہ سازی، ڈرامے کی سی منظر کشی، کچھ آپ بیتی کا سا مزہ، کچھ جگ بیتی کا سا لطف اور پھر سفر کرنے والا جزوِ تماشہ ہوکر اپنے تاثرات کو اس طرح پیش کرے کہ اس کی بات پر لطف ہو اور معلومات افزا بھی۔''

(سخن چند ''دیکھ لیا ایران'' از: افضل علوی، ص ۹)

07.05 خلاصہ

''سفر نامہ'' اردو نثر کی اہم اور مقبول بیانیہ صنف ادب ہے۔ سفر اور انسانی زندگی کا بڑا گہرا، مضبوط اور پرانا رشتہ ہے۔ انسان حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک سفر کر رہا ہے۔ سفر زندگی کے لیے بے حد مفید اور دل چسپ تصوّر کیا جاتا ہے۔ ''سفر کو وسیلۂ ظفر'' بھی کہا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سفر سے مسافر کو بہت کچھ سیکھنے، سمجھنے اور زندگی کے مختلف تجربات حاصل کرنے، مختلف مقامات کے لوگوں سے ملاقات کرنے اور اور مختلف مناظر دیکھنے کے مواقع حاصل ہوتے اور ان سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ انسان تنوّع پسند واقع ہوا ہے۔ یکساں یا روزمرّہ زندگی کے ایک جیسے معمولات و مشاغل کے سبب وہ اکتاہٹ محسوس کرتا ہے لہٰذا اس اکتاہٹ اور یکسانیت کو دور کرنے کی خاطر وہ سفر کرتا ہے جو لوگ اپنے سفر کی روداد قلم بند کر لیتے ہیں ان کی اس تحریر کو ''سفر نامہ'' کہتے ہیں۔ یوں تو سفر کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً: تجارتی، جنگی، مہماتی، مذہبی، علمی، تعلیمی، سیاسی اور تفریحی وغیرہ!

سفر کو عربی زبان میں مسافت طے کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ سفر اس لیے بھی ضروری اور مفید ہے کہ یہ انسان کو متحرک و بیدار رکھتا اور اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں میں خاطر خواہ اضافے کا سبب بنتا ہے۔ بقول تحسین فراقی :

''اسفار نے مختلف سفر ناموں کو جنم دیا ہے جو دیس دیس کی تاریخ، تہذیب، تمدّن، تصوّرِ کائنات، عادات، رسوم، رواج، رجحانات، معتقدات، میلانات اور علوم کا ایک وسیع خزانہ سمیٹے بیٹھے ہیں اور جو بعض صورتوں میں تاریخ، تہذیب اور تمدّن کا سب سے اہم اور بنیادی ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔''

سفرنامہ معلومات کا خزانہ ہوتا ہے۔وہ لوگ جو سفر نہیں کر پاتے یا حالات جنھیں سفر کرنے کی اجازت یا مہلت نہیں دیتے وہ سفر ناموں کے مطالعے سے ذوق سفر کی تشنہ خواہشات کی تکمیل کر کے گھر بیٹھے لطف و مسرّت اور معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔عوامی دل چسپی کے انھیں پہلوؤں، خواہشات اور انسانی فطرت کے مطالبات کے سبب سفر کرنے والوں نے اپنے اپنے سفروں کی روداد تحریر کرنا شروع کی اور اس طرح سفرنامے کو با قاعدہ طور پر ایک اہم اور دل چسپ بیانیہ صنف کی حیثیت اور اہمیت حاصل ہو گی۔

سفرنامے کے لیے خاص تکنیک یا اصول متعین نہیں ہے۔سفرنامے تحریر کرنے کے لیے سفر لازمی شرط ہے سفرنامہ نگار کے مزاج، مشاہدہ اور تحریری صلاحیت سے ہی سفرنامے کا اسلوب اور اصول متعیّن ہوتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ مختلف سفرنامہ نگاروں نے مختلف انداز اختیار کر کے اپنے سفر کی روداد قلم بند کی ہے۔سفرنامے میں داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ سبھی اصناف کے عناصر دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں لیکن ''سفرنامہ'' سفرنامہ ہی ہوتا ہے اسے لیے اسے آپ بیتی، ناول یا افسانہ نہیں سمجھا سکتا۔ایک کامیاب اور اچھے سفرنامے میں عام قاری کے لیے بھی سفر سے متعلق دل چسپی کی سبھی باتوں کا ذکر ضروری ہے۔اس کے لیے اس کا دل چسپ اور پر اثر اسلوب اور ادبی حسن بھی ضروری ہے یعنی سفرنامے میں ادبیت کا ہونا لازمی ہے ورنہ سفرنامہ نہ صرف بے لطف ہو جائے گا بلکہ وہ محض خبر، رپورٹ، اطلاع یا معلومات کا پلندہ بن کر رہ جائے گا۔بقول مرزا حامد بیگ:

''سیاحت کے ثمرات اور تجربات اپنا انعام آپ ہیں......تخلیقی سفرناموں کی شگفتہ بیانی راضی بہ رضا ہونے کی علامت ہے۔''

07.05 فرہنگ

آسودہ	: مطمئن	سیّاح	: مسافر، سیاحت کرنے والا
احتمال	: گمان	صداقت	: سچائی
ارتقا	: ترقی	صعوبت	: پریشانی، مشکلات
اسباب	: سبب کی جمع	صفحہ	: قرطاس کاغذ
استعداد	: صلاحیت	صنف	: ادب کی قسم، خاص ہیئت، ادبی شکل
اسفار	: سفر کی جمع	عالم آب وگل	: پانی اور مٹی کی دنیا، زمین
اطلاق	: لاگو ہونا	عالم بالا	: آسمانی دنیا، عرش
امتیازی وصف	: نمایاں خوبی	فوقیت	: برتری، سبقت
انکشاف	: اظہار	قارئین	: قاری کی جمع
بارآور	: نتیجہ خیز	قربت	: نزدیکی
باطن	: پوشیدہ، چھپا ہوا، اندر کا	قوت	: طاقت
بتدریج	: متواتر، مسلسل	قیاسات	: قیاس کی جمع، تصور
بحری	: دریائی	کشفی	: کراماتی

برّی	:	زمینی	کلیات	:	کل کی جمع
پیچیدہ	:	مشکل، دشوار	کلیتاً	:	پورے طور پر
پیکر	:	جسم	کوائف	:	حالات
تاحال	:	ابھی تک	گردوپیش	:	آس پاس، اطراف
تخیل	:	خیال، خیالی	گنجینہ	:	خزانہ
تکالیف	:	تکلیف کی جمع	مآخذ	:	جہاں سے لیا جائے
تکلیف	:	پریشانی	متجسسانہ ذوق	:	جاننے کی خواہش، جاننے کا شوق
تنوع	:	نیاپن	متعین	:	طے، مقرر
ثانوی	:	دوسری	مجروح	:	زخمی
ثمرات	:	ثمر کی جمع، پھل، نتیجہ	مرقع	:	تصویر، نقش
جامد	:	بے حرکت	مستند	:	تسلیم شدہ، مانا ہوا
جزئیات	:	جز کی جمع، حصے	معروف	:	جانا پہچانا، مشہور
حصول	:	حاصل	مقاصد	:	مقصد کی جمع
حضر	:	قیام، سفر کا الٹا	مملو	:	پُر، بھرا ہوا
خارج	:	ظاہری، باہری	مناظر	:	منظر کی جمع
داخل	:	اندرونی	مواقع	:	موقع کی جمع
روداد	:	رپورٹ، کہانی، تفصیلات	مورخین	:	تاریخ لکھنے والا
زیارت	:	دیدار، درشن	ناقدین	:	ناقد کی جمع، تنقید کرنے والا
ساکت	:	خاموش، پرسکون	نفی	:	انکار
سرمایہ	:	اثاثہ، سازوسامان، دھروہر	وسائل	:	وسیلہ کی جمع، ذریعے
سیاحت	:	سیر و تفریح، گھومنا پھرنا، سفر کرنا	یکساں	:	ایک جیسا

07.07 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ اردو کا پہلا سفر نامہ کس سنہ میں لکھا گیا؟

سوال نمبر۲ مولانا محمد حسین کے سفر نامے کا نام کیا ہے؟

سوال نمبر۳ سفر نامے کے لیے کون سی شرطیں لازمی ہیں؟

سوال نمبر۴ سفرنامے کا شمار کس صنف ادب میں ہوتا ہے؟

سوال نمبر۵ یوسف خاں کمبل پوش نے کس ملک کے سفر کی روداد اپنے سفرنامے میں لکھی ہے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ سفر کی مختلف اقسام تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲ اچھے سفرنامے کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۳ اردو کے اہم سفرنامے کون کون سے ہیں؟

سوال نمبر۴ اردو کے سفرنامے کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۵ سفرنامے کی تعریف، تکنیک اور اصول کیا ہیں؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : سفرنامہ کیسی صنف ادب ہے؟

(الف) بیانیہ (ب) غیر بیانیہ (ج) علامتی (د) افسانوی

سوال نمبر۲ : سفرنامہ کی صنف کس زمرے میں آتی ہے؟

(الف) افسانوی نثری ادب (ب) غیرافسانوی نثری ادب (ج) علامتی صنف ادب (د) شعری صنف

سوال نمبر۳ : اردو کا پہلا سفرنامہ کس نے لکھا ہے؟

(الف) سرسید (ب) مولانا آزاد (ج) یوسف خاں کمبل پوش (د) شبلی نعمانی

سوال نمبر۴ : یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامے کا نام کیا ہے؟

(الف) مسافرانِ لندن (ب) عجائباتِ فرہنگ (ج) سیر ایران (د) سفرنامہ روم ومصروشام

سوال نمبر۵ : سرسید کے سب سے مشہور سفرنامے کا نام کیا ہے؟

(الف) سفرنامۂ یورپ (ب) مسافرانِ لندن (ج) سفرنامہ بلاد اسلامیہ (د) کالا پانی

سوال نمبر۶ : جس صنف ادب میں سفر کی روداد ایک خاص اسلوب میں تفصیل سے لکھی جاتی ہے، اسے کیا کہتے ہیں؟

(الف) داستان (ب) ناول (ج) آپ بیتی (د) سفرنامہ

سوال نمبر۷ : یوسف خاں کمبل پوش نے انگلستان کا سفر کس سنہ میں کیا تھا؟

(الف) ۱۸۳۷ء (ب) ۱۸۳۸ء (ج) ۱۸۴۰ء (د) ۱۸۴۲ء

سوال نمبر۸ : سفرنامہ نگار کے لیے کون سی شرط لازمی ہے؟

(الف) سرمایہ (ب) شوق (ج) سفر (د) مشاہدہ

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (الف) بیانیہ	جواب نمبر۵	: (ب) مسافران لندن
جواب نمبر۲	: (ب) غیرافسانوی صنف ادب	جواب نمبر۶	: (د) سفر نامہ
جواب نمبر۳	: (ج) یوسف خاں کمبل پوش	جواب نمبر۷	: (الف) ۱۸۴۳ء
جواب نمبر۴	: (ب) عجائبات فرہنگ	جواب نمبر۸	: (ج) سفر

07.08 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو سفر نامے کی مختصر تاریخ ۱۹۸۷ء از مرزا حامد بیگ

۲۔ اُردو سفر نامہ انیسویں صدی میں ۱۹۸۹ء از قدسیہ قریشی

۳۔ اُردو ادب میں سفر نامہ ۱۹۸۷ء از انور سدید

۴۔ اُردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۹۵ء از خالد محمود

✲

اکائی 08 اُردو کے اہم سفر نامہ نگار

ساخت

08.01 : اغراض و مقاصد
08.02 : تمہید
08.03 : سفر نامہ نگاری کا آغاز
08.04 : اردو کے اہم سفر نامے
08.05 : خلاصہ
08.06 : فرہنگ
08.07 : سوالات
08.08 : حوالہ جاتی کتب

08.01 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ اردو میں سفر ناموں کی روایت اور ان کے تعارف کے ساتھ اردو کے اہم سفر نامہ نگاروں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔ اس اکائی کے مطالعے سے اردو کے سبھی اہم سفر ناموں اور سفر نامہ نگاروں سے واقفیت حاصل کر سکیں گے اور یہ بھی جان سکیں گے کہ اردو کی غیر افسانوی اصناف میں سفر ناموں کی اہمیت کیا ہے؟ یا اردو میں سفر ناموں کے ارتقا سے بھی متعلّق معلومات بھی حاصل کر سکیں گے۔ اس اکائی میں اردو کے سبھی اہم سفر نامہ نگاروں اور ان کی امتیازی خصوصیات پیش کی جارہی ہیں جن کے مطالعے سے اردو سفر ناموں کے موضوعات، اقسام اور اسالیب کا بھی علم ہو سکے گا۔

08.02 تمہید

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اردو ادب کی مختلف شعری اور نثری اصناف خصوصاً اردو کی غیر افسانوی اصناف میں سفر نامہ نگاری کو ایک اہم اور بیانیہ صنفِ ادب کا درجہ حاصل ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اردو ادب میں سفر ناموں کی وقیع اور قدیم روایت موجود ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ سفر نامے میں سفر نامہ نگار اپنے سفر کی روداد ایک خاص انداز اور اُسلوب میں تحریر کرتا ہے۔ آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ سفر کرنا انسان کی فطرت اور عادت کا اہم وصف ہے۔ نئے نئے جہانوں کی سیر کرنا، نئی نئی معلومات حاصل کرنا، تحیّر خیزی اور لطف اندوزی، تجسّس اور جاننے، سمجھنے کی خواہش ہر انسان کو سفر پر آمادہ کرتی ہے۔ سفر انسان کی بہت سی خفتہ خواہشوں کی تکمیل کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے نئے نئے تجربات اور نئی نئی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ سفر کو وسیلۂ ظفر بھی کہا گیا ہے سفر کے کئی مقاصد ہو سکتے ہیں۔ یہ نجی بھی ہو سکتا ہے اور اجتماعی بھی، تجارتی بھی ہو سکتا ہے اور تفریحی بھی۔

حصولِ تعلیم مہم جوئی، تجسّس اورتحیّر خیزی بھی اس کے اسباب اوراقسام میں شامل ہیں۔ یہ کائنات دراصل انسان کے لئے ہی پیدا کی گئی ہے۔انسان اَشرف المخلوقات ہے۔ذہن وشعور وفکر رکھتا ہےاسی لیےغور وفکر وعمل کے لیےبھی وہ اس کائنات اوراس کے مظاہرات کا مشاہدہ اورمطالعہ کرنا چاہتا ہے۔دنیا کے سبھی مذاہب میں سفر کرنے کی تلقین اس لیے بھی کی گئی ہے تا کہ انسان اس کائنات اوراس سے متعلق مختلف النوّع اشیااور مناظر کوقریب سےاورغور سے دیکھ اور سمجھ سکےاوراس کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکے۔

انسان بنیادی طور پراور فطری طور پر تبدیلی پسند واقع ہوا ہے۔زندگی میں یک رنگی اور یکسانیت اسے پسند نہیں ہے تجسّس اسے نئی باتوں،نئی چیزوں کی تلاش پر اُکساتا ہے۔وہ اپنی اُکتاہٹ اور یکساں معمولاتِ زندگی کو بدلنے کی خاطر اور خودکو مصروفِ عمل رکھنے کی خاطر مختلف ملکوں،علاقوں،شہروں کا سفر کرتا ہےاوران سےاپنے ملک وقوم کے حالات کا موازنہ ومقابلہ بھی کرتا ہےاوراُنھیں محفوظ رکھنے کی غرض سے ضبطِ تحریر میں بھی لاتا ہے تاکہ اس کے مشاہدات،تجربات،خیالات اور تاثرات واحساسات سے دوسرے لوگ بھی مستفیض ہو سکیں۔

سفرنامہ کی تکنیک اوراس کے فنّی اُصول اگرچہ متعیّن نہیں ہیں لیکن سفر نامے میں داستانوی انداز،افسانوی اورڈرامائی عناصر،سوانحی اورآپ بیتی کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ سیاسی،سماجی،تہذیبی،تاریخی اور جغرافیائی حالات کی جھلکیاں بھی شامل ہوتی ہیں اورادبی،لسانی خصوصیات بھی!مذکورہ تمام خصوصیات کے باوجود سفر نامہ اپنی علاحدہ پہچان رکھتا ہے۔وہ نہ داستان ہے،نہ ناول،ڈرامہ یا افسانہ ہے نہ ہی سوانح یا آپ بیتی ہے اور نہ ہی تہذیبی وتاریخی وجغرافیائی حالات کا عکّاس ہے۔ایک اچھے سفر نامے میں مذکورہ بالا سبھی خصوصیات یا عناصر شامل ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

سفرنامہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک دل چسپ،پُر اثر،مقبول صنفِ ادب ہے جسے سفر نامہ نگار کا مخصوص اُسلوب مزید دلکش و موٴثر اور پُرکشش بنا دیتا ہے۔گویا واقعات وحالات کی عکّاسی کے ساتھ ساتھ،اُسلوب بھی ایک کامیاب اور معیاری سفر نامے کے لیے لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔سفر نامہ حصولِ معلومات کا موثر ذریعہ ہے۔سفر انسان کو جسمانی اور دماغی اعتبار سے متحرّک اور فعّال رکھتا ہے۔سفر کرنے سے ذہنی وفکری وسعت پیدا ہوتی ہے۔سفر سے جو تجربات حاصل ہوتے ہیں وہ کسی اور ذرائع سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے انسان اور ترقّی یافتہ قوموں کے افراد نے سفر کے ذریعے غیر معمولی ترقّی کر کے خود کواوراپنی ملک وقوم کو بامِ عروج پر پہنچایا ہے۔سفر نامہ لکھنے کی روایت اسی قدر قدیم ہےجس قدر کہ تاریخ نویسی کی۔یہ کہنا دشوار ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا سفر نامہ کون سا تھا اور اُسے کس نے لکھا تھا۔البتہ مغربی موٴرّخین''ہیروڈوٹس'' کو دنیا کا پہلا سفر نامہ نگار تسلیم کرتے ہیں۔دنیا کی ہر زبان میں سفر نامے تحریر کیے گئے ہیں۔اردو زبان میں سفر نامہ نگاری کا آغاز ۱۹/ویں صدی عیسوی میں ہوااور یوسف خاں کمبل پوش اردو کے پہلے سفر نامہ نگاراوران کا تحریر کردہ سفر نامہ:''تاریخِ یوسفی''جو کہ''عجائباتِ فرہنگ'' کے نام سے مشہور ہوااردو کا پہلا دستیاب سفر نامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۸۴۷ء میں مطبع العلوم دہلی کالج سے پہلی بار شائع ہوا تھا۔اس کے بعد اردو زبان میں سفر ناموں کے لکھے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا جو کہ آج تک جاری ہے۔اردو زبان میں سیاسی،تاریخی،جغرافیائی،مذہبی اور خالص سیر وتفریح کی خاطر کئی سفر نامے لکھے جا چکے ہیں۔اردو میں حج ناموں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔اردو کے ابتدائی دَور کے سفر نامے بہت زیادہ دل چسپ اور پُر لطف اس لیے نہیں تھے۔کہ ان میں تاریخی اور جغرافیائی حالات کو شدّت اور تفصیل سے قلم بند کیا گیا ہے۔کئی سفر نامے محض معلومات کا ذخیرہ بن کر رہ گئے ہیں جس کے سبب ان میں سفر نامے کی اصلی روح یعنی ادبیت،تحیّر خیزی اور تخلیقیت کے عناصر کم نظر آتے ہیں اور سادگی اور بے کیفی زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

۲۰ ؍ویں صدی نصف اوّل میں لکھے جانے والے سفر ناموں میں سفر نامہ نگار کے نجی مشاہدات، تاثرات اور آرا کا بھی اظہار ملتا ہے اور ان کی ترتیب و پیش کش بھی قدرے متاثر کن ہے۔ تقسیمِ وطن کے بعد اردو سفر ناموں کی نوعیت تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔ اس عہد کے سفر ناموں میں یادِ ماضی ''ناسٹلجیا'' اور بیتے دنوں کی سنہری یادوں کا کرب نمایاں نظر آتا ہے۔ ان سفر ناموں میں سفر نامہ نگار کے دل کا درد بھی سمٹ آیا ہے جس کے سبب عام قاری کے لیے بھی یہ سفر نامے خاص دل چسپی کا سبب رکھتے ہیں اور گزشتہ تہذیبی، سماجی اور تاریخی حالات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ جیسا کہ ایک اچھے اور کامیاب سفر نامے میں داستان طرازی، ناول نگاری، افسانہ نگاری، ڈرامائیت، محاکات آفرینی اور دل چسپ و پُر لطف اُسلوب اور انداز بیان ضروری ہے۔ سفر نامہ، صرف سفر نامہ ہی ہوتا ہے جس میں مسافر اپنے مشاہدات و تجربات کو بیان کرتا ہے۔ لیکن اس کے بیان میں شامل سیاسی، سماجی حالات بھی شامل ہوتے ہیں کیوں کہ سفر نامہ ایک بیانیہ صنفِ ادب ہے اس لیے اس میں داستانویت، ڈرامائیت، افسانویت اور دل چسپ اُسلوب کا ہونا ضروری ہے کہ اسی سے سفر نامے میں ادبیت اور تخلیقیت کے ساتھ دل چسپی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے اور سفر نامے کا فن داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، آپ بیتی وغیرہ سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے سفر نامہ محض مسافر کے سفر کی روداد ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنے عہد کے مختلف النّوع حالات و واقعات کے اظہار کے ساتھ مختلف بیانیہ اصناف کا عکّاس بھی ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگار کے لیے ادیب یا مصنّف ہونا لازمی شرط نہیں ہے لیکن جب کوئی مستند ادیب سفر نامہ لکھتا ہے تو ادبیت کی شان کے سبب اس کا سفر نامہ زیادہ پُر لطف، دل چسپ اور مقبولِ خاص و عام بن جاتا ہے۔

ابتدائی دَور کے سفر نامے کسی نہ کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے لکھے جاتے تھے۔ کسی نے محض معلومات یکجا کرنے کی خاطر سفر نامے لکھے تو کسی نے تاریخی و سیاسی حالات کی ترجمانی کی خاطر، کسی نے تجارت کی غرض سے سفر کیا تو کسی نے حج بیت اللہ کے فرض کی ادائیگی کو اپنے سفر کا سبب بنایا۔ اس اعتبار سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سفر نامہ محض سیر و تفریح کا ذریعہ یا سبب نہیں ہے بلکہ تعمیری اور نیک مقاصد میں بھی اس کے اسباب میں شامل ہیں۔ سفر نامہ بہت اہم مقبول صنفِ ادب اس لیے بھی ہے کہ وہ محض اور عصری حالات و واقعات کا عکّاس نہیں ہوتا بلکہ سفر نگار کے نجی مشاہدات و تجربات، احساس و تاثرات کا آئینہ بھی ہوتا ہے۔ ان کے مطالعے سے وہ لوگ بھی مستفید ہوتے ہیں جو کہ سفر نہیں کر سکتے یا جن کے لیے بوجوہ سفر کرنا دشوار ہوتا ہے۔ سفر نامہ ایک مقبول صنفِ سخن اس لیے بھی ہے کہ اس کے مطالعے سے ہمیں اجنبی علاقوں، شہروں، ملکوں اور ان کے سیاسی، تاریخی، تہذیبی اور جغرافیائی حالات کا علم ہوتا ہے وہاں کے انسانوں کی طرزِ معاشرت سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے نئے اور انوکھے کرداروں سے ملاقات ہوتی ہے اور ہماری عام معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور ہم گھر بیٹھے ایسے ملکوں کی سَیر کر لیتے ہیں جہاں تک پہنچنا عام آدمی کے لیے ممکن نہیں ہوتا اس لحاظ سے سفر نامے کو عملاً سفر کا بدل کہا گیا ہے۔

جیسا کہا جا چکا ہے کہ سفر اور زندگی کا بڑا گہرا اور مضبوط رشتہ ہے۔ زندگی بجائے خود ایک سفر ہے جس میں ہر آن تبدّل اور تغیّر کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہ دنیا سرائے فانی ہے اور انسان ایک مسافر ہے۔ آنے، جانے اور سفر کرنے کا عمل زندگی کے لیے لازمی ہے اور انسانی سفر کے یہ سلسلے اَزل سے جاری ہیں اور اَبد تک جاری رہیں گے۔ وہ سفر جو ایک مقام سے دوسرے مقام یا ایک ملک سے دوسرے ملک کے لیے عمداً کیا جاتا ہے اس کی نوعیت اور مقاصد قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ مسافر یا سفر کرنے والا پوری تیّاری اور ایک خاص مدّت کے لیے عازمِ سفر

ہوتا ہے۔اس نوع کے سفروں میں نئے جہانوں کی دید کا شوق تو شامل ہوتا ہی ہے اس کے علاوہ وہاں کے انسانوں کے حالات اور ان کی طرزِ معاشرت سے واقفیت اور اپنے تجربات اور معلومات میں اضافہ کر کے اسے دوسروں تک پہچانے کا جذبہ بھی کارفرما رہتا ہے۔یہی وہ عوامل و اسباب و مقاصد تھے کہ جن کے حصول کے لیے سیّاحوں یا مسافروں نے بیرونی ممالک کے سفر طے کر کے دنیا کو ایک دوسرے کے قریب تر کرنے اور نئی نئی معلومات فراہم کرنے کرنے کی سعی کی۔سفر نامے اس لیے بھی لکھے گئے تا کہ بعد میں آنے والے مسافروں کی رہنمائی بھی ہو سکے۔وہ سفر کی دشواریوں، مہمات، تحیّر خیزیوں، خطرات، سمت و رفتار اور ذرائع و وسائل سے آگاہ ہو سکیں۔ان مقاصد کے حصول کے لیے ابتداً سفر سے متعلّق زبانی قصّے بیان کیے جاتے تھے پھر ڈائریوں، روزنامچوں اور خطوط کے ذریعے اس روداد کو پیش کیا جانے لگا۔ابتداً بحری سفروں کی روداد قلم بند کی جاتی تھیں کہ وہی ایک بڑا سفر کا ذریعہ تھا۔ان رودادوں میں بحری سفر میں پیش آنے والے حادثات اور حفاظتی طریقے بھی قلم بند کیے جاتے تھے تا کہ آئندہ سفر کرنے والے مسافر ان سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

ابتدائی بحری سفری داستانوں میں سند باد جہازی کی طرح دیگر کئی قصّے بہت مشہور ہوئے۔ابتدائی عہد میں الف لیلوی داستانیں بھی بہت مقبول تھیں جن میں بات میں بات پیدا کرنے کی تکنیک اور سفر کے مہماتی تجربات کو مبالغے کے ساتھ دل چسپ انداز میں کیا جاتا تھا۔پھر سفر ناموں کے موضوعات میں وسعت اور تبدیلی پیدا ہوتی گئی اور حقیقی حالات کی عکاسی کی جانے لگی۔پہلے سفر ناموں کی تحریری شکل کے آغاز سے متعلّق وثوق سے کہنا دشوار ہے۔ڈاکٹر خالد محمود نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

> ''خیال کیا جاتا ہے کہ سفر مکمّل کر کے اپنے گھروں کو واپس آنے والے مسافر دوستوں اور عزیزوں کے سامنے سفر کی روداد بیان کرتے تھے۔بعد میں اسی روداد نے تحریری سفر نامے کی شکل اختیار کر لی۔لیکن ایسا کب اور کس طرح ہوا یہ راز ہنوز تشنۂ تحقیق ہے۔''
>
> (اُردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص:۶۱)

08.03 سفر نامہ نگاری کا آغاز

اس سلسلے میں مغربی محقّقین نے یونان کے سیاح ہیروڈوٹس کو پہلا سفر نامہ نگار تسلیم کیا ہے۔یونان، روم اور مصر کی طرح ہندوستان بھی قدیم تہذیبی وراثت کا ملک ہے۔سفر کرنے کا شوق مذکورہ بالا تہذیبی ملکوں کی طرح ہندوستانیوں کو بھی تھا۔ہندوستان کی قدیم مذہبی کتابوں رامائن، مہابھارت، ویدوں اور پرانوں کے مطالعے سے بھی اس شوق کی تصدیق ہو جاتی ہے۔جیسے جیسے ذرائع نقل و حرکت اور سفر میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے سفر کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور پھر سفر نامے کے لکھے جانے کی سلسلے بھی دراز ہوتے گئے۔

چھٹی صدی قبل مسیح کے آس پاس آمد و رفت کے ذرائع بہت بڑھ جانے اور سفر کی آسانیاں پیدا ہو جانے کے سبب حصولِ تعلیم اور تجارتی مقاصد کے لیے سفر کرنے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوتا گیا۔دنیا کے قدیم سفر ناموں کے مطالعے سے مختلف ملکوں خصوصاً ہندو ستان کی تہذیبی تمدّنی قدامت اور عظمت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔قدیم یونانی سیاح میگس تھیز کا سفر نامہ (......)''سفر نامہ ہند'' پہلا دستیاب سفر نامہ ہے جس میں قدیم ہندوستان اور ہندوستانیوں سے متعلّق اہم معلومات بیان کی گئی ہیں۔میگس تھیز نے ۳۰۳ قبل مسیح میں اس وقت ہندوستان کا سفر کیا تھا جبکہ یہاں چندر گپت مَوریہ کی حکومت تھی۔

میگس تھیز کا یہ سفر نامہ محض سیاحتی سفر نامہ ہی نہیں ہے بلکہ مَوریہ عہد کا ایک مستند تاریخی ماخذ یا دستاویز بھی ہے۔اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چندر گپت مَوریہ کا عہد ہندوستانی تہذیب کا سنہرا دَور ہی نہ تھا بلکہ ہندوستان کا کئی بیرونی ممالک سے سفارتی رابطہ قائم ہو چکا تھا۔دوسرا اہم سفر نامہ چینی راہب فاہیان کا تھا جو کہ بُدھ مت کا ماننے والا تھا اور جس نے کپل وستو، پاٹلی پتر، ویشالی وغیرہ بدھ زیارت گاہوں کی تلاش اور ان کے مشاہدے کی غرض سے ہندوستان کا سفر کیا تھا۔میگس تھیز کی طرح فاہیان کا سفر نامہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔مذکورہ دونوں سیّاحوں کے بعد ہیون سانگ ۶۳۰ء میں ہندوستان آیا اور ۶۴۵ء تک یہاں پندرہ سال تک قیام کر کے اور طیہاں کے حالات کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کر کے اس نے یہاں کے راجہ ہریش چندر کے دَورِ حکومت کے حالات اور یہاں کی خوش حالی اور اَمن واَمان کا ذکر اپنے سفر نامے میں بطورِ خاص کیا ہے۔چھٹی اور ساتویں عیسوی سے ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کا دَور شروع ہوتا ہے۔سرزمین عرب سے چل کر اس عہد میں کئی سیّاحوں اور تاجروں نے ہندوستان کا رُخ کیا اور تجارت وتبلیغ کی خاطر مختلف علاقوں کا سفر کیا۔

ہندوستان آنے والا پہلا عرب تاجر سلیمان تھا جس نے اپنے سفر نامے ''سلسلۃ التواریخ'' مطبوعہ ۱۸۴۵ء میں ہند کے جغرافیائی، سیاسی، تاریخی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔اس اثنا میں کئی عرب تاجر اور سیّاح ہندوستان آتے رہے اور یہاں قیام کر کے یہاں کے حالات کا تفصیلی ذکر اپنی عربی کتابوں میں کرتے رہے۔اس ضمن میں معروف عرب سیّاح حکیم ناصر خسرو بلخی کی کتاب ''المسافرین'' بطورِ خاص قبل ذکر ہے۔اس عہد کا سب سے معروف اور اہم سیّاح اور تاریخ داں ابوریحان البیرونی تھا جس نے محمود غزنوی کے عہد میں ۹۹۸ء سے ۱۰۳۰ء کے دوران ہندوستان کا سفر کر کے ایک گراں قدر تصنیف ''کتاب الہند'' لکھی جس میں اس نے ہندوستان کے تاریخی، تہذیبی اور تمدّنی حالات کو تفصیل کے ساتھ رقم کیا ہے۔مذکورہ بالا دونوں عرب سیّاحوں کے بعد ابن جبیر اندلسی کا سفر نامہ ''رحلۃ ابن جبیر'' کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس سفر نامے میں داستان سفر کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

ابن بطوطہ اس عہد کا سب سے مشہور سیّاح تسلیم کیا جاتا ہے۔جس نے آٹھویں صدی ہجری میں چودھویں صدی عیسوی تک مختلف ممالک کے سفر طے کر کے اپنے مشاہدات کو قلم بند کیا ہے۔جن کے مطالعے سے ہندوستانی تاریخ، علوم وفنون اور جغرافیہ سے متعلق بہت سی نئی معلومات کا علم ہوا ہے۔اس کا عربی سفر نامہ اس کے مشاہدات وتجربات کی کامیاب ترجمانی کرتا ہے۔''عجائب الاسفار'' اس کے سفر نامے کا نام ہے جس کا اردو ترجمہ محمد حیات الحسن نے ''سفر نامہ ابن بطوطہ'' کے نام سے کر کے اسے ۱۹۰۱ء میں شائع کیا۔

''تزکِ بابری'' اگر چہ ترکی زبان میں لکھی گئی بابر کی آپ بیتی ہے لیکن اس میں بابر جس طرح ہندوستان جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی، تمدنی، سیاسی، سماجی حالات کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا ہے اس کے سبب کئی جگہ اس کتاب پہ سفر نامہ کا گمان ہوتا ہے۔جن یورپی سیّاحوں نے ہندوستان کا سفر کر کے سفر نامے تحریر کیے ان میں برنیر، مارکو پولو، اور پارتھولوموڈاز کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

08.04 اردو کے اہم سفر نامے

ہندوستان کے بیشتر اردو مصنّفین یا سیّاحوں نے ابتداً اپنے سفر کی روداد فارسی زبان میں تحریر کی ہے کہ یہی اس دَور کی علمی وسرکاری زبان تھی۔قباد بیگ، میر محمد حسین لندنی، نواب کریم خاں، شیخ اعتصام الدین اور مرزا طالب اصفہانی اس دَور کے اہم سفر نامہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ان سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں سے ہی اردو سفر ناموں کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔

اردو سفر ناموں کا با قاعدہ آغاز اگر چہ ۱۹رویں صدی سے ہوتا ہے لیکن اس کی جڑیں ۱۸رویں صدی تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔اس زمانے میں لکھی جانے والی اردو داستانوں یا نثری قصّوں میں سفر نامے کے ایسے ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں کہ جن کے سبب اردو میں باقاعدہ طور پر سفر نامہ نگاری کا آغاز ہوا۔جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اردو کا پہلا سفر نامہ یوسف خاں کمبل پوش کا ''تاریخِ یوسفی'' معروف بہ ''عجائباتِ فرہنگ'' ہے۔یہ سفر نامہ یوسف خاں کمبل پوش کے ۱۸۳۷ء کے سفرِ انگلستان کی روداد ہے۔اس سفر نامے میں ایک حقیقی سیّاح کے مشاہدات اور جذبات پڑھنے کو ملتے ہیں۔اس سفر نامے سے متعلق ڈاکٹر تحسین فراقی کی یہ رائے درست ہے کہ:

> ''کمبل پوش کی ''تاریخِ یوسفی'' یا ''عجائباتِ فرہنگ'' اردو کا پہلا سفر نامہ ہی نہیں، سفر نامے کا اہم ترین سنگِ میل بھی ہے اور اس پر جدید سفر نامے کی اصطلاح کا اطلاق بھی بہت حد تک ہوتا ہے۔ جہاں تک سفرِ یورپ کا تعلّق ہے اردو میں اب تک اس باب میں ۳۰/۳۵ سفر نامے لکھے جا چکے ہیں جن کا سلسلہ کمبل پوش سے عطاء الحق قاسمی تک پھیلا ہوا ہے لیکن ''عجائباتِ فرہنگ'' ان میں اوّلیت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ اُسلوب اور لوازمے کے اعتبار سے بھی ایک بے مثال سفر نامہ ہے۔''

(مقدمات عجائباتِ فرہنگ، ص:۴۷)

یوسف خاں کمبل پوش کا یہ سفر نامہ اس کے سفر شوق کی ایسی روداد ہے جس میں بغیر کسی مبالغے، یا تصنّع کے کمبل پوش نے اپنے جذبات و احساسات، مشاہدات و تجربات اور آنکھوں کے دیکھے واقعات اور مناظر کو فطری بے ساختگی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔

بقول ڈاکٹر خالد محمود:

> ''حیرانی اور شوق کی یہ وارفتگی اس کے حرف حرف سے ٹپکتی ہے، مناظر کا حُسن، واقعات کی تحیّر خیزی انوکھے مشاہدات اور نئے تجربات کمبل پوش کو مست و بے خود کر دیتے ہیں.......واقعات و مناظر کی مستی اس پر نشے کی سی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔''

(اُردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص:۹۶)

یوسف خاں کمبل پوش اگر چہ باضابطہ ادیب یا شاعر نہیں تھا لیکن دل چسپ اور رواں اسلوب کے اعتبار سے کئی جگہ اس کی تحریر میں ناول، افسانہ یا ڈرامے کا گمان ہوتا ہے۔اس کی نثر سلیس بھی ہے اور کہیں کہیں مقفّٰی اور مسجّع بھی۔ برمحل اور موزوں محاورے اور ضرب الامثال کا استعمال اس کی تحریر کو دل چسپ، با معنی اور پُر لطف بنا دیتے ہیں۔یہ سفر نامہ ۱۸۴۷ء میں دہلی کالج کے مطبع العلوم سے پہلی بار ''تاریخِ یوسفی'' کے نام سے شائع ہوا۔اس کے بعد اب تک اس کے کئی ایڈیشن مختلف ناشروں نے شائع کر دیے ہیں۔اس سفر نامے کے بعد اردو میں با قاعدہ طور پر سفر نامہ لکھنے سلسلہ شروع ہو گیا۔ڈائری اور روز نامچے کی شکل میں بھی کئی سفر نامے لکھے گئے لیکن یوسف خاں کمبل پوش کے بعد اردو میں لکھا جانے والا دوسرا اہم سفر نامہ سر سید احمد خاں کا ''مسافرانِ لندن'' تھا جس میں انھوں نے ایک خاص مقصد یعنی تلاشِ علم و ہنر اور طریقۂ تعلیم کے مطالعے کی خاطر لندن کا سفر طے کیا تھا۔ان کا مقصد سیر و تفریح نہیں تھا بلکہ قوم کو عصری اور جدید علوم و فنون سے آراستہ کرنا اور انھیں تعلیم یافتہ بنانا تھا چناں چہ سر سیّد احمد نے لندن کے قیام کے دوران وہاں کے طریقۂ تعلیم، جدید علوم و فنون کے نصابات کا بغور مطالعہ کیا۔دورانِ قیامِ لندن سر ولیم مور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب تحریر کیا۔اپنی قوم کی پستی اور بدحالی اور انگریزوں کی ترقّی کا موازنہ کیا۔

دورانِ سفر پیدا ہونے والے سرسید کے جذبات واحساسات سے متعلق محمد اسمٰعیل پانی پتی نے لکھا ہے:

''جن مقاصد کے لیے سرسید نے یہ سفر اختیار کیا اور جن حالات وواقعات سے دورانِ سفر ان کو سابقہ پڑا، ان میں سے ہر واقعہ سرسید کی لیے مستقل اذیت بن گیا۔ جب وہ کسی خوشی کی محفل میں شریک ہوئے معاً ان کے سامنے مسلمانوں کی بدحالی کی تصویر کھنچ گئی اور وہ آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔ جب کوئی رنج وغم کا موقع ان کے سامنے آیا تو فوراً ان کو اپنی قوم کی نکبت اور فلاکت یاد آئی اور سخت پژمردہ اور مضمحل ہو گئے۔''

(مسافرانِ لندن، از: سرسید احمد خاں، ص: ۲۰)

سرسید کے اس سفرنامے کا اُسلوب سادہ، سلیس اور حقیقت پسندانہ ہے جس میں انھوں نے اپنے دلِ دردمند اور اپنے اندر کے کرب و اضمحلال کو نہایت اخلاص اور سچّائی کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے۔ ملکوں وقوم کی ترقّی اور بدحالی دُور کرنے کی لیے سرسید کے پاس ایک نسخہ صحیح تعلیم و تربیت حاصل کر کے قوم کے نونہالوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ یہی ان کا مشن تھا اور اسی مشن ومقصد کو پورا کرنے کی خاطر انھوں نے ساری زندگی اس کے لیے وقف کر دی تھی۔ لندن کا یہ سفر بھی ان کے اسی مشن کا حصہ تھا۔

اپنے سفرنامے میں انھوں نے صاف صاف لکھا ہے۔

''جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقّی چاہتے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اس پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک اُنھیں کی زبان میں انھیں دیے جائیں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ کی چوٹی پر بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے لیے کھود دیئے جائیں۔ اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی زبان میں نہ دیے جائیں تو کبھی ہندوستان کو شائستگی اور تربیت کا درجہ نصیب نہ ہوگا۔ یہی سچ ہے، بس یہی سچ ہے، یہی سچ ہے۔''

(مسافرانِ لندن، از: سرسید احمد خاں، ص: ۱۹۷)

سرسید احمد تقریباً ڈیڑھ سال لندن میں مقیم رہے اور اس دوران پورے طور پورا اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہے اور وہاں رہ کر انہوں نے جو کچھ دیکھا اور سمجھا اسے پوری صداقت اور دردمندی کے ساتھ اپنے اس سفرنامے میں تحریر کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے سرسید کا سفرنامہ ایک عام سیاحتی سفرنامے سے مختلف ومنفرد سفرنامہ ہے جس کی اہمیت ہمیشہ قائم رہے گی۔ سرسید کا دوسرا سفرنامہ ''سفرنامۂ پنجاب'' ہے جسے مولوی سید اقبال علی نے قلم بند کیا جو کہ سرسید کے ساتھ اس سفر میں شریک رہے۔ اس سفرنامے میں اہلِ پنجاب کے ذریعہ سرسید کی قدردانی اور مہمان نوازی کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ سفر بھی مقصدِ خاص کے تحت کیا گیا جس میں سرسید کو بڑی کامیابی نصیب ہوئی اور ان کے حوصلے اور ارادے کو استحکام اور پختگی حاصل ہوئی۔ قوم میں حصولِ تعلیم کے تئیں بیداری اور دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر سرسید نے یہ سفر کیا اور پنجاب کے مختلف شہروں میں منعقدہ جلسوں میں پُر جوش تقاریر کر کے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے کی سعی کی۔ اس سفرنامے کی زبان بھی سادہ و سلیس ہے۔ عہدِ سرسید کا ایک اور سفرنامہ ''سفرنامۂ یورپ'' ہے جسے نثار علی بیگ نے تحریر کیا تھا۔ یہ سفرنامہ علمی مقاصد کے حصول کی غرض سے کیا گیا تھا اور اسے سفرنامہ نگار نے روزنامچے کی شکل میں قلم بند کیا ہے۔ اس سفرنامے میں یورپ کے ماحول، حالات، رسم ورواج، طرزِ معاشرت اور طریقۂ تعلیم پر تفصیلی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

شاہی سفر نامہ ''مسیر حامدی''، ریاستِ رام پور کے نواب محمد حامد علی خاں کا لکھا ہوا ہے جس میں انھوں نے دنیا کے اہم مما لک کے سفر کی روداد رقم کی ہے۔لیکن نواب یا فرمانروا ہونے کے سبب وہ آزادانہ طور پر سیر و سیاحت کی لذّت سے محروم ہونے کے سبب اپنے مشاہدات و تجربات کو اس طرح بیان نہیں کر سکے ہیں جس طرح ایک عام سیّاح بیان کرتا ہے،شبلی کا سفر نامہ ''سفر نامۂ روم و مصر و شام'' کا شمار اردو کے اہم سفر ناموں میں ہوتا ہے۔شبلی نعمانی شاعر، ادیب، سوانح نگار اور ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ مؤرّخ اور سفر نامہ نگار بھی تھے۔انھوں نے ۱۳۰۹ھ میں روم و مصر و شام کا سفر کیا اور اپنے بزرگوں اور دوستوں کے اصرار پر اسے سفر نامہ کی شکل میں پیش کر دیا۔شبلی کا یہ سفر علمی نوعیت کا تھا۔اسلام اور اسلامی مما لک کے خلاف مغربی مؤرّخین نے جو غلط بیانیاں عام کر رکھی تھیں شبلی ان کا حقائق کی روشنی میں جائزہ لینا چاہتے تھے۔ان کا اس سفر ایک مقصد یہ بھی تھا اور اس سفر نامے میں شبلی نے اسلامی مما لک سے متعلّق پھیلائے ہوئے مفروضات کا دلائل کے ساتھ جواب دیا ہے اور علمی و تاریخی اعتبار سے اپنے سفر نامے کو معلومات کا بیش قیمت خزانہ بنا دیا۔اس سفر نامہ میں مذکورہ بالا تینوں ملکوں کے جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی، تمدّنی، علمی، تعلیمی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی حالات اور وہاں کے باشندوں کی طرزِ معاشرت، فیّاضی اور مہمان نوازی کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس کے مطالعے سے اس دَور کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔شبلی کا یہ سفر اسلامی مما لک کو دیکھنے کی غرض سے ہی نہ تھا بلکہ ''ہیروز آف دی اسلام'' سے متعلق ضروری مواد حاصل کرنا بھی ان کے مقصدِ سفر میں شامل تھا اور انھیں دونوں مقاصد کے حصول کی خاطر انھوں نے یہ سفر کیا تھا۔سفر نامے کی زبان عالمانہ اور معیاری ہے۔شبلی نے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔شبلی ہی کی طرح مولانا محمد حسین آزاد کا سفر نامہ ''سیرِ ایران'' بھی ایک اہم سفر نامہ ہے۔مولانا آزاد نے دوسرا سفر نامہ ''وسط ایشیا کی سیر'' کے نام سے لکھا لیکن اوّل الذّکر کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔''سیرِ ایران'' کو آغا محمد طاہر نے مرتّب کر کے کتابی شکل میں شائع کیا۔ابتداًیہ سفر نامہ روزنامچوں کی شکل میں تھا۔مولانا محمد حسین آزاد نے سفرِ ایران سے متعلق اپنے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مجھے اس سفر میں بڑی غرض کتابوں کی تلاش تھی اور اس لیے زیادہ یہ کہ جامع لغات فارسی کے لیے سرمایہ جمع کر سکوں۔''

مولانا محمد حسین آزاد بنیادی طور پر ایک کامیاب انشا پرداز تھے لہٰذا ان کا یہ سفر نامہ ان کے مخصوص طرزِ اسلوب اور انشا پردازی کی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔مولانا محمد حسین آزاد نے دورانِ سفر ایران کے علمی اور تاریخی مقامات کا مشاہدہ کیا اور انھیں دیکھنے کے بعد اپنی خوشی یا رنج کو متاثر کن انداز میں ظاہر کیا ہے۔نادر شاہ کی قبر کو دیکھ کر جو عبرت حاصل ہوئی اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

''........اللہ اکبر وہ نادر شاہ جس کی تلوار کو اَمان نہ تھی، جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے لشکر پھوس کی اُڑتے تھے، وہ ایک ٹوٹے ہوئے چبوترے پر پڑا ہے۔''

مولوی محمد جعفر تھانیسری کا سفر نامہ ''کالا پانی'' اردو کا اہم ترین مقبول عام سفر نامہ اس لیے بھی ہے کہ اس میں مولانا تھانیسری کی اٹھارہ سالہ قید و بند کی دردانگیز اور لرزہ خیز روداد کو قلم بند کیا گیا ہے۔اس کے مطالعے سے بھی انگریزوں کے ظلم و ستم، جبر و استبداد و تعصّب اور ہندوستانیوں کی حُبّ الوطنی اور بلند حوصلگی اور عالی ہمّتی کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ہندوتان کی پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کئی اعتبار سے خاص اہمیت

رکھتی ہے۔اس جنگ میں شامل ہندوستانی وطن پرستوں کی قربانیاں اور شہادتیں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھی جاتی اور یاد کی جاتی رہے گی۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری کا سفرنامہ ''تواریخِ عجیب'' جو کہ ''کالا پانی'' کے نام سے مشہور ہوا کئی لحاظ سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اگر چہ سوانحی انداز کا سفر نامہ ہے لیکن اس میں مولوی محمد جعفر تھانیسری نے انگریزوں کے ظلم وستم کی روداد کو تفصیل سے بیان کر کے اسے ایک تاریخی باب بنا دیا ہے۔مولوی محمد جعفر تھانیسری کی گرفتاری سزا اور اذیتوں کی پوری داستان اس سفرنامے میں بیان کی گئی ہے جسے پڑھ کر سخت سے سخت دل انسان بھی موم بن جاتا ہے اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ سفرنامہ اس طویل ظلم وستم کی روداد ہے جو ایک طویل عرصے تک انگریزوں نے ہندوستانیوں سے رَوَا رکھی اور ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیے۔مولوی محمد جعفر تھانیسری پر ہر قسم کا ظلم وستم کیا گیا لیکن نہ تو وہ خوف زدہ ہوئے اور نہ انھوں نے انگریزوں کے آگے سرِ تسلیم خم کیا۔انھیں پہلے پھانسی کی سزا سنائی گئی بعد میں اس سزا کو حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا میں تبدیل کر دیا گیا اور انھیں جزائر انڈمان بھیج دیا گیا۔سزا کی مدّت پوری ہونے کے بعد مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اس پوری داستان ظلم وستم کو ''تواریخِ عجیب'' معروف بہ ''کالا پانی'' کے عنوان سے روزمرّہ بول چال کی زبان میں تحریر کیا ہے۔اس سفرنامے کی سیاسی اور تاریخی حیثیت مسلّم ہے۔

''سفرنامہ بلادِ اسلامیہ'' مولوی عبدالرحمٰن امرت سری کا سفرنامہ ہے۔جس میں انھوں نے مصر وشام وروم کی سیاحت کی روداد رقم کی ہے۔مولانا نے یہ سفر ۱۸۹۸ء میں کیا تھا۔اس سفرنامے میں بلادِ اسلامیہ سے متعلّق واقعات وحالات کو دل چسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان کے اردو سفرناموں میں منشی محبوب عالم کا ''سفرنامہ یورپ'' اور ''سفرنامہ بغداد'' نواب محمد علی خاں کا ''سیاست فتح زمانی'' شیخ عبدالقادر کا ''مقام خلافت'' اور خواجہ حسن نظامی کے سفرنامے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔مولانا عبیداللہ سندھی کا سفرنامہ ''کابل میں سات سال'' بھی ایک اہم اور دل چسپ سفرنامہ ہے۔اس عہد کا سب سے اہم اور وقیع سفرنامہ علامہ سید سلیمان ندوی کا ''سیرِ افغانستان'' ہے سید سلیمان ندوی نے یہ سفر حکومتِ افغانستان کی دعوت پر کیا تھا۔اس سفر کی خاص اور اہم بات یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال اور سر راس مسعود بھی ان کے ہمراہ تھے اور یہ سفر ۱۹۳۳ء میں کیا گیا تھا۔اگر چہ افغانستان یہ سفر بہت مختصر یعنی صرف چار روز کا تھا لیکن اس مختصر مدّت میں بھی علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے گراں قدر تاثرات کو جس طرح اس سفرنامے میں پیش کیا ہے وہ کئی اعتبار سے بے حد اہم اور مفید ہیں۔ابتداً یہ سفرنامہ ماہنامہ ''معارف'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا بعد میں اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔اس کے مطالعے سے اس زمانے کے سیاسی، سماجی، تاریخی، جغرافیائی، علمی، تعلیمی، تہذیبی اور ادبی حالات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔سفرنامے کا اسلوب عالمانہ، حقیقت پسندانہ اور دل چسپ ہے۔اس کو پڑھ کر قاری خود کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

اس سفرنامے سے متعلّق معروف ادیب ونقّاد انور سدید کی رائے مبنی بر حقیقت ہے کہ:

''شبلی نے ''سفرنامۂ روم ومصر وشام'' لکھ کر اس صنف ادب میں نئی طرح کی بنیاد ڈالی تھی۔ارتقا کا اگلا قدم سید سلیمان ندوی نے 'سیر افغانستان' لکھ کر اٹھایا ہے۔''

(اُردو میں سفرنامہ، ص:۲۵۸)

ڈاکٹر خالد محمود لکھتے ہیں:

''سیرِ افغانستان' بظاہر ایک روداد سفر ہے مگر اس مختصر سے زمینی سفر کو سید سلیمان ندوی نے تاریخی اور

جذباتی سفر بنا دیا ہے۔ان کے اسلوب میں جذبے کی شدّت کے علاوہ وارفتگی شوق، بے تابی اور بے ساختگی نے یکجا ہو کر شعر کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔''

(اُردو میں سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ،ص:۱۸۹)

قاضی عبدالغفار کا سفر نامہ ''نقشِ فرنگ'' ان کے سفرِ انگلستان کی روداد ہے جو کہ ۱۹۲۱ء میں حکومتِ برطانیہ کی دعوت پر تحریکِ خلافت اور دیگر سیاسی معاملات سے متعلّق تبادلۂ خیال کی غرض سے کیا گیا تھا۔اس سفر میں جو وفد گیا تھا اس میں قاضی عبدالغفار بھی بحیثیتِ رکن شامل تھے۔قاضی عبدالغفار نے انگریزوں کی چالاکی اور مکر کو جس طرح دیکھا اور محسوس کیا اسے اپنے سفر میں بھی اسی طرح صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ان کا یہ اقتباس ان کی اسی صاف گوئی کا غماز ہے:

''برطانیہ عظمیٰ کے دارالسلطنت کا پہلا نظارہ میرے دل میں سوائے اس کے اور کوئی اثر نہ کر سکا کہ ایک کالا آدمی اس سرزمین آزادی وحُرّیت میں غلاموں کی حیثیت رکھتا ہے۔جو قوم دعویٰ کرتی ہے کہ اس نے انیسویں صدی میں دنیا سے غلامی کا نام ونشان مٹا دیا ہے اس سلطنت کے ہر چپے پر اقتصادی، معاشرتی تمدن اور سیاسی غلامی کی بدترین کیفیات اہل نظر کے لیے عبرت آموز ہیں۔اس سرزمین حُرّیت میں میں نے ہر قدم پر اپنی غلامی کے نشان دیکھے.......... ہر جگہ محکوم قوم کی ذلّت ورُسوائی اس کا پیچھا کرتی ہے۔برطانوی زندگی ایک آئینہ ہے جس میں کالا رنگ کچھ اور زیادہ صاف نظر آتا ہے۔''

(نقشِ فرنگ،ص:۵۲)

اس سفر نامے سے متعلّق ڈاکٹر خالد محمود کی یہ رائے درست ہے کہ:

''قاضی عبدالغفار کا سفر نامہ اس اعتبار سے ایک نئی جہت کی نشان دہی کرتا ہے کہ اس میں گرد وپیش کے مناظر ومظاہر اور تاریخ کے اوراق کی سیر کے بجائے سفر نامہ نگار نے اپنے جذبات وتاثرات اور تجربات و مشاہدات کی سیر کرائی ہے......قاضی عبدالغفار کا سفر نامہ اپنے اندازِ فکر اور طرزِ تحریر کی وجہ سے سفر نامہ نگاری کے جدید رجحان کی نشان دہی کرتا ہے۔''

(اُردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ،ص:۱۹۲)

''سیاحت نامہ'' حیدرآباد دکن کے نواب محمد ظہیرالدین نے لکھا ہے۔یہ سفر انھوں نے یورپ اور امریکہ کے لیے ۱۹۳۳ء میں کیا تھا۔اس میں اس سفر کی یادداشتوں کو سلیقہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

قاضی ولی محمد کا سفر نامہ ''سفر نامۂ اندلس'' ان کے سفر کی داستان بیان کرتا ہے۔جس میں اُندلس کے تاریخی اور تہذیبی حالات کو دل چسپ انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔یہ سفر ۱۹۲۴ء میں کیا گیا تھا۔

نواب سلطان جہاں ریاست بھوپال کی فرماں روا تھیں۔ان کی بہو شاہ بانو نے ان کے ہمراہ لندن کا سفر کیا تھا۔جسے انھوں نے ''سیاحتِ سلطانی'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔خود سلطان جہاں بیگم نے ''روضۃ الرّیاحین'' کے نام سے ایک طویل سفر نامہ دو جلدوں

میں شائع کیا تھا جو کہ ان کے سفرِ حج سے متعلق ہے۔ مذکورہ بالا دونوں سفر ناموں کی مصنّفہ دو خواتین ہیں۔ جنھوں نہ صرف بیرونی ممالک کے سفر کیے بلکہ انھیں قلم بند کر کے کتابی صورت میں شائع بھی کرایا ہے۔ خاتون سفر نامہ نگاروں میں ایک نام نازلی رفیعہ سلطان بیگم کا بھی ہے۔ جنہوں نے ۱۹۰۸ء میں یورپ کا سفر کیا تھا اور اس کی روداد ''سیرِ یورپ'' کے نام سے شائع کی۔ لیکن یہ سفر نامہ زیادہ متاثر کن نہیں ہے۔ اس اثناء میں کئی سفر نامے تحریر کیے گیے لیکن انھیں خاصی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ یہاں صرف انھیں سفر ناموں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو سفر نامہ نگار، اسلوب اور فن کے اعتبار سے اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی اور ان کی اہلیہ بیگم نشاط النساء کے سفر نامے ''سفر نامۂ حجاز اور سفر نامۂ عراق'' میں پہلا سفر نامہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں سفرِ حج کی روداد بھی بیان کی گئی ہے۔ اس سفر میں حسرت موہانی کے ساتھ ان کی اہلیہ بیگم نشاط النساء بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ دوسرے سفر نامے میں عراق کی تہذیب و معاشرت پر تفصیلی طور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ زبان کی سادگی اور سلاست کے سبب بھی یہ ایک دل چسپ سفر نامہ ہے۔

سر رضا علی خاں کا ''اعمال نامہ'' پر خود نوشت اور سفر نامہ دونوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس کی نثر خوب صورت اور باوقار ہے۔ جگہ جگہ اشعار کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ عطیہ بیگم فیضی کا سفر نامہ ''زمانۂ تحصیل'' دراصل خطوط کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ دورانِ قیامِ لندن میں انہوں نے جو خطوط تحریر کیے تھے انھیں کو سفر نامے کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس میں لندن کی زندگی کی تہذیبی جھلکیوں کو سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

''سفر نامۂ شیخ الہند'' بھی ایک اہم سفر نامہ اس لیے ہے کہ اس میں معروف عالم دین مولانا محمود الحسن اور ان کے ساتھیوں کے سفرِ حجاز اور قیدِ مالٹا کے حالات کو مولانا حسین احمد مدنی نے قلم بند کر کے شائع کیا تھا۔ یہ سفر نامہ اہم حقیقی واقعات پر مبنی ہونے کے سبب اپنی تاریخی اور سیاسی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ محمد اسد کا سفر نامہ ''طوفان سے ساحل تک'' قدرے مختلف نوعیت کا سفر نامہ اس لیے ہے کہ اس میں سفر نامہ نگار نے مادی یا ظاہری طور پر ہی نہیں بلکہ روحانی یا ذہنی سفر کی روداد بھی تحریر کی ہے۔ تلاشِ حق کے متلاشی اس سفر نامہ نگار نے اپنی منزل یا مراد یا ساحل تک پہنچنے کی حیرت انگیز اور دل چسپ داستان کو نہایت دل چسپ انداز میں بیان کر کے پڑھنے والوں کے لیے دل چسپی کا سامان فراہم کیا ہے۔ یہ سفر نامہ عرفانِ حیات کا ایک خوب صورت نمونہ ہے۔ جس میں اُسلوب اظہار کے دل چسپ مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔

خواجہ احمد عباس صحافی اور فکشن نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انھوں نے ایک سفر نامہ ''مسافر کی ڈائری'' بھی لکھا ہے۔ عباس صاحب نے ۱۹۳۸ء میں امریکہ سمیت تقریباً سترہ ملکوں کا سفر پانچ ماہ کے عرصے میں کیا تھا۔ عباس صاحب زندگی، ادب اور صحافت کے سلسلے میں اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتے تھے انھوں نے اسی مخصوص نظر اور نظریے کے تحت ممالک غیر کا مشاہدہ کر کے اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ مخصوص نظریے کے شدّت کے سبب یہ سفر نامہ زیادہ اہمیت اختیار نہیں کر سکا۔

عصرِ حاضر میں سفر کی سہولتوں میں خاطر خواہ اضافہ ہو جانے کے سبب سفر کرنے والوں کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے۔ سائنس اور تکنیک کی ترقی نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ عصر حاضر میں لکھے جانے والے سفر ناموں کی نوعیت اور ان کا انداز، ماضی میں لکھے جانے والے سفر ناموں سے مختلف و منفرد ہے۔ اب جغرافیائی یا تاریخی حالات پر اتنا زور نہیں دیا جاتا جتنا کہ پرانے سفر ناموں میں دیا جاتا تھا۔ آج کے عہد کے سفر ناموں میں سفر نامہ نگار کے جذبات و احساسات اور ردِّ عمل کو بے ساختہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ بے باکی اور

صاف گوئی بھی آج کے سفرناموں کی خوبی بن گئی ہے۔انھیں تمام باتوں کے سبب نئے سفرناموں کا انداز تبدیل ہو چکا ہے۔ نئے سفرناموں میں حقائق کے بیان کی تفصیلات یا معلومات فراہم کرنے سے زیادہ تخلیقیت یا تخلیقی انداز پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے۔قدیم سفرناموں میں اگر جگ بیتی کا عنصر زیادہ ہوتا تھا تو نئے سفرناموں میں آپ بیتی کا عنصر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ نئے سفرنامے واقعات کے اظہار کے مقابلے میں فکشن سے زیادہ قریب ہیں۔ نئے سفرناموں میں مناظر اور واقعات سے سفرنامہ نگار کی ذات زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔

آزادی کے بعد لکھے جانے والے اردو کے اہم سفرناموں میں ڈاکٹر سید عابد حسین کا ''رہِ نورِ دِشوق''، صالحہ عابد حسین کا 'سفر زندگی کے لیے سوز وساز'، سید احتشام حسین کا سفرنامہ ''ساحل اور سمندر''، ابراہیم جلیس کا ''نئی دیوارِ چین''، سید ابوالحسن ندوی کا ''ترکی میں دو ہفتے'' حکیم محمد سعید خاں ''یورپ سفرنامہ''، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ''سفرِ آشنا''، مرزا ادیب کا ''ہمالہ کے اس پار''، خواجہ غلام السیدین کا ''دنیا میرا گاؤں''، محمد طفیل کا ''مسافرانہ''، وزیر آغا کا ''بیس دن انگلستان میں''، مسعود احمد برکاتی کا ''دو مسافر، دو ملک''، صغرا مہدی کا ''میخانوں کا پتہ'' اور سیفی سرونجی کا سفرنامہ ''یہ تو سچا قصہ ہے'' اردو کے یادگار، دل چسپ، معیاری اور نمائندہ سفرنامے ہیں۔

سید عابد حسین کا سفرنامہ ''رہِ نورِ دِشوق'' کا تعلق سفرِ عراق وشام سے ہے۔ عابد حسین نے بذریعہ خطوط اس سفر کی روداد اپنی اہلیہ صالحہ عابد حسین کے نام لکھی تھی جسے انھوں نے مرتب کر کے سفرنامے کے بطور شائع کیا تھا۔ عابد صاحب کامیاب مترجم اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقی فن کار بھی تھے۔ان کے اس سفرنامے میں ان کی تخلیق نثر کے خوب صورت نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔جن کے مطالعے سے خاص وعام سبھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں صالحہ عابد حسین بنیادی طور پر فکشن نگار تھیں۔انھیں سیر وسیاحت اور دنیا دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔انھوں نے ہندوستان کئی شہروں کے علاوہ بیرونی ممالک کے بھی سفر کیے اور ان کی روداد بھی قلم بند کی لیکن جو تفصیلات انھوں نے جس طرح مکہ معظّمہ اور مدینہ منوّرہ خصوصاً روضۂ اطہر کی جذباتی انداز میں بیان کی ہے اس کی مثال مشکل سے کہیں اور مل سکتی ہے۔صالحہ عابد حسین کا اسلوب افسانویت، محاکات آفرینی اور بیانیہ کی بہترین مثال ہے۔

پروفیسر احتشام حسین کا سفرنامہ ''ساحل اور سمندر'' میں امریکہ، لندن اور پیرس کے سفروں کی داستان بیان کی گئی ہے۔ احتشام حسین صاحب کا سنجیدہ اور عالمانہ انداز اس سفرنامے کا خاص وصف ہے۔مولانا ابوالحسن علی ندوی کا سفرنامہ ''ترکی میں دو ہفتے''، علمی اور دینی تبلیغ و خطاب سے عبارت ہے۔زبان و بیان عالمانہ بصیرت سے پر ہے۔مسعود احمد برکاتی کا سفرنامہ ''دو مسافر، دو ملک'' بے حد دل چسپ اور پر از معلومات ہے۔بقول خالد محمود :

> ''اس سفرنامے کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اردو میں یہ پہلا سفرنامہ ہے جو بچوں کی ذہنی و علمی سطح کو ملحوظ رکھ کر لکھا گیا ہے۔''

حکیم احمد سعید نے بھی کئی اچھے سفرنامے تحریر کیے ہیں۔وہ حکیم تھے اور ان کے سفروں کا خاص مقصد علمِ طب سے متعلق معلومات حاصل کرنا تھا۔مرزا ادیب کا سفرنامہ ''ہمالہ کے اس پار'' ڈائری کی بیانیہ تکنیک کو اختیار کیا گیا ہے۔اور آخر میں خطوط کا ساخطابیہ انداز بھی ملتا ہے۔''سفرِ آشنا'' معروف ادیب و نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا سفرنامہ ہے جس میں جرمنی، ناروے، امریکہ، کینڈا اور انگلستان کے سفر کی روداد دل چسپ انداز میں بیان کی ہے۔اس سفرنامے میں ادبی تقریبات اور ادبی ماحول کا ذکر نمایاں نظر آتا ہے۔جس کے مطالعے سے متعلقہ

ممالک میں اردو زبان وادب کی صورتِ حال کا علم ہوتا ہے۔معروف ادیب،مترجم اور ماہرِ تعلیم خواجہ غلام السیدین نے یوں تو کئی سفر نامے تحریر کیے ہیں لیکن ان کا سفر نامہ ''دنیا میرا گاؤں'' ہر اعتبار سے ایک معیاری، دل چسپ اور معلومات افزا علمی سفر نامہ ہے۔محمد طفیل مدیر نقوش لاہور کا سفر نامہ ''مسافرانہ'' میں اِٹلی، جرمنی اور برطانیہ کے سفر کی کہانی دل چسپ انداز میں بیان کی گئی ہے۔عصرِ حاضر کے بے حد مقبول اور اہم سفر ناموں میں مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

اردو سفر نامے کی تاریخ میں مستنصر حسین تارڑ ایسے سفر نامہ نگار ہیں جنھوں نے بغیر کسی خاص مقصد کے حصول کے اور سفر کرنے کی غرض سے بطور مسافر سفر نامے تحریر کیے ہیں۔یہی سبب ہے کہ ان کے سفر ناموں میں سفر نامے کے فن اور اصول واُسلوب کی سچّی اور اچھی جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں۔وہ مسافر کی نظر سے ہی ہر واقعے اور منظر کو دیکھتے محسوس کرتے اور پھر اسے اپنے سفر ناموں میں اسی طرح بیان کر دیتے ہیں جس طرح انھیں محسوس ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر نامے واقعیت،تحیّر خیزی،لطف انگیز،معلومات اور دل چسپی کے عناصر سے پُر نظر آتے ہیں۔ان کے فطری، بے تکلّف اور حقیقت پسند اسلوب نے ان میں مزید جاذبیت اور اثر انگیزی پیدا کر دی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مشاہدہ بہت وسیع اور اظہارِ بیان کی صلاحیت بہت اچھّی ہے جس کے سبب وہ قاری کو اپنے تحریر کے سحر میں مبتلا کر لیتے ہیں۔

''نکلے تری تلاش میں،اُندلس میں اجنبی،خانہ بدوش اور غارِ حرا'' وغیرہ ان کے ایسے کامیاب ترین نمائندہ سفر نامے ہیں جنھیں بار بار پڑھا جاتا ہے اور جو بار بار موضوعِ بحث بنتے ہیں۔مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر ناموں سے اردو سفر ناموں کے وقار اور معیار میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔وہ ایسے سفر نامہ نگار ہیں کہ جن کے سفر ناموں سے ترغیب پا کر نئی نسل کے ادیبوں نے بھی سفر نامے لکھنے کی کوشش کی ہیں۔گہری نظر، جزئیات نگاری،محاکات آفرینی اور دل چسپ اندازِ بیان تارڑ کے سفر ناموں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔مستنصر حسین تارڑ کی یہ خوبی بھی ہے کہ وہ نہ صرف دوسروں کی خوبیوں اور کمزوریوں یا احوال واقعی کو بیان کرتے ہیں بلکہ اپنی شخصیت کے کمزور کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں۔اردو سفر ناموں کی تاریخ میں مستنصر حسین تارڑ ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر بنیادی طور پر ایک اہم اور کامیاب فکشن نگار ہیں۔انھوں نے رپورتاژ اور سفر نامے بھی تخلیق کیے ہیں۔وہ تخلیقی فن کار ہیں۔ان کی ہر تحریر تخلیق تخلیقیت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ان کے تحریر کردہ سفر نامے ''جہانِ دیگر،ستمبر کا چاند اور دکھلایئے لے کے جائے اسے مصر کا بازار'' میں تخلیقیت کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر خالد محمود:

> ''ماضی سے انھیں بہت پیار ہے......وہ حال میں سفر کرتے کرتے اچانک ماضی میں پہنچ جاتی ہیں ......ان کے سفر ناموں میں ظاہری مناظر و مظاہر، کی اہمیت نسبتاً کم ہے۔اس لیے وہ ظاہر سے زیادہ باطن میں سفر کرتی ہیں......وہ ذہن و ذات کی مسافر ہیں ....زندگی کی معمولی جزئیات سے ایسے نکات برآمد کر لیتی ہیں کہ قاری کے ذہن کے تمام گوشے منوّر ہو جاتے ہیں........ناول کی طرح ان کے سفر نامے بھی

تحیّر سے خالی نہیں......وہ اپنے منفرد اُسلوبِ نگارش، حسین تشبیہوں اور بلیغ تبصروں سے اس احساس تحیّر کو زندہ رکھتی ہے۔''

(اُردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ،ص:۲۷۵-۲۷۶)

قدرت اللہ شہاب کے سفر نامے''ایسے بنی اسرائیل''اور''تو ابھی رہ گزر میں ہے''،افضل علوی کا سفر نامہ''دیکھ لیا ایران''رام لال کے سفرنامے''زرد پتوں کی بہار''اور''خواب خواب سفر''عبداللہ ملک کے سفر نامے''کیوبا سے چند خطوط''اور''ارضِ جنّت''''سوویت یونین''عطاءالحق قاسمی کا سفر نامہ''شوقِ آوارگی''ذوالفقاراحمد تابش کا''جوار بھاٹا''ڈاکٹر وحید قریشی کا سفر نامہ''چین کی حقیقتیں اور افسانے''نجمہ افتخار کا''سایونارا''صغریٰ مہدی کا''سیر کر دنیا کی غافل''وغیرہ کا شمار اردو کے اہم ،معیاری، دل چسپ اور پُر لطف سفر ناموں میں ہوتا ہے۔

اُردو میں کی سفر نامے،حج نامے یا سفرِ حج کے بطور قلم بند کیے گئے ہیں جن میں مذہبی عقیدت مندی، جوش خروش، جذباتی اور روحانی کیف وسرور، سرزمینِ عرب بالخصوص مکہ ومدینہ کے علاقے، مناسک حج، مقاماتِ حج وغیرہ جغرافیائی، معاشرتی، مذہبی اور تہذیبی حالات کی تفصیلات کا ذکر ایسے دل چسپ اور پُر اثر انداز میں کیا گیا ہے کہ یہ سفر نامے محض مذہبی عقیدت مندی کی روداد نہ ہوکر تاریخی اور تہذیبی اہمیت کے حامل بھی بن گئے ہیں۔حج کے سفر ناموں میں نواب سلطان جہاں بیگم کا''روضۃ الرّیاحین''اورممتاز مفتی کا''لبیّک''بہت مقبول اہم سفر نامے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان سے متعلق کیے گیے سفروں کی روداد یا سفر نامے بھی بڑی تعداد میں لکھے گیے ہیں جن میں تقسیمِ وطن کا کرب بھی ہے یادِ ماضی کے نقوش بھی، تلخ وشیریں،خوشگوار اور ناخوشگوار واقعات کا ذکر بھی رشتوں کا احترام بھی اور تہذیبی وتاریخی اقدار وحالات کی تفصیلات اور حُبّ الوطنی یا وطن سے لگاؤ کا احساس بھی شامل ہے جن کے مطالعے سے گزشتہ سیاسی، سماجی، تہذیبی، ادبی، تاریخی، جغرافیائی، حالات کا بخوبی ہوجاتا ہے۔اس نوع کے سفر ناموں میں خواجہ حسن نظامی کا سفر نامہ''سفرِ پاکستان''عبدالماجد دریا آبادی کا''پاکستان میں ڈھائی ہفتے''بلراج کومل کا''جزیروں کی سرگوشیاں''ڈاکٹر کیول دھیر کا''خوشبو کا سفر''جوگندر پال کا''پاکستان کی یاترا''اور رام لعل کا سفر نامہ''زرد پتّوں کی بہار''کے علاوہ ہندوستان سے متعلق لکھے گئے سفر ناموں میں حمید احمد خاں کا سفر نامہ''میری بھارت یاترا''وزیر آغا کا''ایک طویل ملاقات''انتظار حسین کا''زمین اور فلک اور''جمیل زبیری کا''موسموں کا عکس''رفیق ڈوگر کا''اے آب رودِگنگا''فرمان فتح پوری کا''دیدو بازدید''ممتاز مفتی کا''ہند یاترا''وغیرہ ایسے سفرنامے ہیں جو ہر لحاظ سے دل چسپ ،پُر لطف، پُر اثر، معلومات افزا، تحیّر خیز اور خلوص و محبت کے جذبوں سے سرشار ہیں۔ایسا لگتا یہ سفر نامے قلم کی سیاہی سے نہیں خونِ جگر سے رقم کیے گیے ہیں۔جن میں ماضی کی بیتی یادوں کو زبان عطا کردی گئی ہے۔

جو انسانیت، نیکی، خلوص، اخلاق اور تہذیب وتاریخ کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں جنھیں جب پڑھیے ایک نیا لطف محسوس ہوتا ہے۔یہ بھی سفر نامے حقیقی واقعات وحالات وجذبات واحساسات کا آئینہ ہیں۔ان سفر ناموں میں سرحد، مذہب کی دیواریں ٹوٹتی اور انسانیت کی خوشبو مہکتی محسوس ہوتی ہے۔یہ سبھی سفر نامے ہندوپاک معروف عالم، ادیب، شاعر یا فکشن نگاروں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں اس لیے ان میں افسانویت بھی ہے اور دل داری بھی، حسرت ویاس کے اداس بادل بھی ہیں اور یقین وامید کی تازہ ہوائیں بھی، شکوے شکایتیں بھی ہیں اور

خلوص ومحبت ویگانگت وانسانیت کی لازوال مثالیں بھی دیکھی اورمحسوس کی جاسکتی ہیں۔ان کے مطالعے سے نہ صرف دونوں ملکوں کے باسیوں کے مابین پھیلائی گئی غلط فہمیاں دُور ہوتی ہیں بلکہ ایک دوسرے کوسمجھنے اورایک دوسرے کے قریب آنے مواقع بھی ملتے ہیں۔کسی نے یہ سچ ہی کہا ہے کہ زبان وادب اورادیب وفن کار کوکسی حدود یا سرحد میں محصور ومقید نہیں کیا جاسکتا۔انسان اوراس کے باہمی رشتے آفاقی ہوتے ہیں جنہیں ملکوں اورقوم کے بندھنوں میں باندھ کرمحدود نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستان سے ہندوستان اور ہندوستان سے پاکستان آنے جانے والے سیاحوں یا مسافروں کے جذبات میں کئی لحاظ سے یکسانیت، ہم آہنگی،ہم خیالی اورخلوص ومحبت کی یکساں اقدار، باہمی مشترک قدروں کی طرح باہم دگرنظر آتی ہیں۔یہ سبھی سفر نامے دراصل محبت نامے ہیں جن میں ماضی کے قیمتی خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ان سفر ناموں کے مطالعے سے جہاں کئی نئی معلومات کا علم ہوتا ہے وہیں کئی سوالات بھی ذہن میں اُبھرتے اور پڑھنے والے کوغوروفکر وعمل پرآمادہ کرتے ہیں۔یہ سبھی سفر نامے ہمارے ادب کا قیمتی اور یادگار سرمایہ ہیں۔

اردو میں سفر ناموں کی وقیع روایت موجود ہے۔اردو میں ہرطرح کے سفر نامے لکھے گیے ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موضوع،اُسلوب اورزبان وبیان کے اعتبار سے ان سفر ناموں نے اردوادب کووقیع تر،وسیع تر،بہتر اورپُر لطف وپُر اثر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ان سفر ناموں کے سبب اردوادب کا دامن وسیع اور مالا مال ہوگیا ہے۔

08.05 خلاصہ

اردوادب میں سفر ناموں کی بڑی وقیع روایت موجود ہے۔سفر نامہ ایک غیرافسانوی، بیانیہ صنف ادب ہے۔اردو میں علمی،ادبی، تعلیمی،تہذیبی،تجارتی،مہماتی، مذہبی،تاریخی،جغرافیائی،سیاسی،تفریحی غرضیکہ ہرموضوع سے متعلّق بے شمار سفر نامے لکھے گئے ہیں۔تفریحی سفر ناموں کے ساتھ ساتھ حج ناموں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔اردو کے کئی سفر نامے ایسے بھی ہیں جوکہ اردو کے صاحبِ طرز،معروف اُدبا نے قلم بند کیے ہیں۔اردو کے کئی سفر ناموں میں سفر کی داستان کے ساتھ ساتھ علمی،ادبی،جغرافیائی،تاریخی،سیاسی، مذہبی،تہذیبی معلومات، خوب صورت مناظر،حیرت انگیز واقعات اورمعلومات عامّہ کا خزانہ محفوظ ہے۔اس اعتبار سے اردو کے کئی سفر نامے محض علمی،ادبی اعتبار سے ہی نہیں معلومات کے اعتبار سے بھی مستند حوالے اورمعیاری انداز کے حامل قرار دیے جاسکتے ہیں۔سفر نامے کی رویت اسی قدر قدیم ہے جس قدر تاریخ نویسی یا تحریر کی ایجاد کی۔اس کائنات کی تشکیل بھی انسانی سفر کی ہی مرہونِ منت ہے۔آدم سے لے کرآج تک سفر کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔یوں بھی اس دنیا کوسرائے فانی اوراس کے باسیوں کومسافر ہونے تعبیر کیا جاتا ہے۔دنیا کی ہرزبان میں سفر نامے لکھے گئے ہیں۔ اُردوزبان میں سفر نامے کا آغاز انیسویں صدی عیسوی میں یوسف خاں کمبل پوش کے سفر نامے ''تاریخ یوسفی''،یعنی''عجائباتِ فرنگ'' سے ہوتا ہے جوکہ ۱۸۴۷ء میں کتابی صورت میں شائع ہوکرمنظرعام پرآیا اورجوکہ انگلستان کے سفر سے متعلق دل چسپ اورتفصیلی سفر نامہ ہے۔

اردو کے ابتدائی سفر نامے زیادہ دل چسپ اور پراثر وپرلطف نہیں ہیں لیکن بیسویں صدی اورتقسیمِ وطن کے بعد لکھے جانے والے سفر ناموں میں اُسلوب،معلومات،تحیرخیزی اور ماضی وحال کے دل چسپ اور پُر لطف،معلومات افزا حالات وواقعات خوب صورتی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔اردو کے کئی سفر ناموں میں سفر کی روداد کے ساتھ ساتھ داستانوی،افسانوی اورڈرامائی انداز بھی ملتا ہے اور جگ بیتی کے ساتھ ساتھ آپ بیتی جھلکیاں بھی دیکھی جاسکتی ہیں اورسفر نامہ نگاروں کے مشاہدات،تجربات،احساسات،جذبات،تاثرات اورخیالات کے اظہار کے لحاظ سے بھی کئی سفر نامے دل چسپ اورمعیاری کہے جاسکتے ہیں۔

اردو میں خطوط، ڈائری، روزنامچے کی صورت میں بھی سفرنامے تحریر کیے ہیں۔ اردو کے اہم ترین سفرناموں میں سر سید احمد خاں کا سفرنامہ ''مسافرانِ لندن اور سفرنامۂ پنجاب'' نثار علی بیگ کا ''سفرنامۂ یورپ'' نواب محمد حامد علی خاں کا ''مسیر حامدی''، شبلی نعمانی کا ''سفرنامہ مصرو روم وشام''، محمد حسین آزاد کا ''سیرِ ایران'' مولوی محمد جعفر تھانیسری کا ''تواریخ عجیب یعنی کالا پانی''، مولوی عبدالرحمٰن امرت سری کا ''سفرنامہ بلادِ اسلامیہ''، منشی محبوب عالم کا ''سفرنامۂ یورپ'' نواب محمد عمر خاں کا ''سیاحت فتح خانی''، شیخ عبدالقادر کا ''مقام خلافت'' مولانا عبیداللہ سندھی کا ''کابل میں سات سال'' سید سلیمان ندوی کا ''سیرِ افغانستان''، قاضی عبدالغفار کا ''نقشِ فرنگ'' نواب محمد مظہرالدین کا ''سیاحت نامہ'' نواب سلطان جہاں بیگم کا ''روضۃ الرّیاحین'' نازلی رفیعہ سلطان بیگم کا ''سیرِ یورپ'' خواجہ حسن نظامی اور مولانا حسرت موہانی کے ''سفر نامے'' سر رضا علی خاں کا ''اعمال نامہ''، بیگم عطیہ فیضی کا ''زمانۂ تحصیل'' مولانا محمود الحسن کا ''سفرنامۂ شیخ الہند'' محمد اسد کا ''طوفان سے ساحل تک'' خواجہ احمد عباس کا ''مسافر کی ڈائری'' صالحہ عابد حسین کا ''سفر زندگی کے لیے سوز و ساز'' احتشام حسین کا ''ساحل اور سمندر'' ابراہیم جلیس کا ''نئی دیوار چین'' سید ابوالحسن علی ندوی کا ''ترکی میں دو ہفتے'' حکیم محمد سعید کا ''یورپ نامہ'' خواجہ غلام السیدین کا ''دنیا میرا گاؤں'' مرزا ادیب کا ''ہمالہ کے اس پار'' محمد طفیل کا ''مسافرانہ'' وزیر آغا کا ''بیس دن انگلستان میں'' گوپی چند نارنگ کا ''سفرِ آشنا'' مسعود احمد برکاتی کا ''دو مسافر دو لوگ'' صغریٰ مہدی کا ''سیر کر دنیا کی غافل'' اور سیفی سرونجی کا سفرنامہ ''یہ تو سچا قصہ ہے'' ہے۔

مذکورہ سفرناموں کا شمار اردو کے اہم ترین، نمائندہ اور مقبول سفرناموں میں ہوتا ہے۔

08.06 فرہنگ

آرا	: رائے کی جمع	کرب	: رنج، غم
آراستہ	: سجا ہوا	کوشاں	: کوشش
اذیت	: تکلیف، ایذا	گمان	: خیال، تصوّر
ارتقا	: ترقّی	مبالغہ	: بڑھا چڑھا کر بات کرنا
اسالیب	: اسلوب کی جمع	محظوظ	: لطف اندوز
استبداد	: ظلم، جبر	محکوم	: غلام
استحکام	: مضبوطی، پختگی	مرقّع	: تصویر
اشیاء	: شے کی جمع	مرہون منّت	: احسان مند
اصرار	: خواہش، حکم	مستفیض	: فیض یاب
اقسام	: قسم کی جمع	مسجّع	: سجاوٹ والی
امتیازی	: نمایاں	مُسَلّم	: تسلیم شدہ، مانی ہوئی
بام	: عروج بلندی، اونچائی	مشترک	: ملی جلی، باہمی آپسی
پژمُردہ	: کمہلایا ہوا، بجھا ہوا	مضمحل	: بے چین

پستی	: زوال	معمولات	: معمول کی جمع،عمل
تحیّر	: حیرت	مقاصد	: مقصد کی جمع
تصنّع	: بناوٹ،فرضی	مقفّٰی	: قافیے والی
جاذبیت	: کشش،سحر جادو	مقیم	: قیام پذیر
جہت	: رُخ	مکر	: فریب،دھوکا
حُرّیت	: آزادی	ملحوظ	: لحاظ
خفیہ	: پوشیدہ،چھپی ہوئی،اندرونی	ممالک	: ملک کی جمع
سرِتسلیم خَم کرنا	: جھک جانا،ہار مان لینا	مؤثر	: پُراثر
سزائے حبس دَوام	: عمرِقید	مؤرّخ	: تاریخ داں
سنگ میل	: میل کا پتھر جو مسافر کی رہنمائی کرتا ہے	مہمات	: مہم کی جمع
سیّاح	: سیر کرنے والا	نکات	: نکتے کی جمع
شائستہ	: مہذّب	نکبت	: خستہ حالی،بدحالی،غریبی
شناخت	: پہچان	واقفیت	: معلومات،جانکاری
صداقت	: سچّائی	وسعت	: پھیلاؤ
ضرب الامثال	: کہاوت	وسیلہ	: ذریعہ
عصر	: زمانہ،عہد	وصف	: خوبی
علوم	: علم کی جمع	وقیع	: باوقعت،قیمتی،اہم
عناصر	: عنصر کی جمع	ہم نوا	: ہم خیال
فنون	: فن کی جمع	ہنوز	: اب تک،ابھی

08.07 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ دنیا کا پہلا سفرنامہ کا نام کیا ہے؟

سوال نمبر۲ اُردو کے پہلے سفرنامے کا نام لکھیے۔

سوال نمبر۳ اُردو کا پہلا سفرنامہ کس سنہ میں لکھا گیا؟

سوال نمبر۴ احتشام حسین کے سفرنامے کا نام بتائیے۔

سوال نمبر۵ مولانا ابوالحسن ندوی کے سفرنامے کا نام بتائیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ صنفِ سفر نامہ پر اظہار خیال کیجیے۔

سوال نمبر۲ اُردو کے سفر نامے کے ارتقا پر ایک نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر۳ سفر نامہ ''عجائباتِ فرہنگ'' کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۴ قرۃ العین حیدر کے سفر ناموں کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۵ سفر ناموں میں کن کن اصناف کی جھلک کس حد ملتی ہے۔

سوال نمبر۶ اُردو کے اہم سفر نامے کون سے ہیں؟ تفصیل سے جواب لکھیے۔

سوال نمبر۷ مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں کیا خوبیاں پائی جاتی ہیں؟

سوال نمبر۸ ایک اچھے اور کامیاب سفر نامے میں کون خصوصیات ضروری ہے؟

سوال نمبر۹ سر سید خاں کے سفر نامے ''مسافران لندن'' کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۱۰ اُردو کا سب سے اہم اور دل چسپ سفر نامہ کون سا ہے؟ تفصیل سے لکھیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : یوسف خاں کمبل پوش نے کس سنہ میں انگلستان کا سفر کیا تھا؟

(الف) ۱۸۳۶ء (ب) ۱۸۳۸ء (ج) ۱۸۳۷ء (د) ۱۸۴۷ء

سوال نمبر۲ : ''کتاب الہند'' کے مصنف کون تھے؟

(الف) البیرونی (ب) ابن بطوطہ (ج) بابر (د) سلمان تاجر

سوال نمبر۳ : ''مسافرانِ لندن'' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

(الف) شبلی نعمانی (ب) محمد حسین آزاد (ج) سر سید احمد خاں (د) یوسف خاں کمبل پوش

سوال نمبر۴ : سفر نامہ ''سیرِ افغانستان'' کس نے لکھا؟

(الف) سید سلیمان ندوی (ب) شبلی نعمانی (ج) مولانا آزاد (د) سر سید احمد خاں

سوال نمبر۵ : قاضی عبدالغفار نے انگلستان کا سفر کب کیا تھا؟

(الف) ۱۹۲۰ء (ب) ۱۹۲۱ء (ج) ۱۹۲۵ء (د) ۱۹۱۹ء

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ج) ۱۸۳۷ء

جواب نمبر۲ : (الف) البیرونی

جواب نمبر۳ : (ج) سر سید احمد خاں

جواب نمبر۴ : (الف) سید سلیمان ندوی

جواب نمبر۵ : (ب) ۱۹۲۱ء

08.08 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردوسفرنامے کی مختصر تاریخ ۱۹۸۷ء از مرزاحامد بیگ

۲۔ اُردوسفرنامہ انیسویں صدی میں ۱۹۸۹ء از قدسیہ قریشی

۳۔ اُردوادب میں سفرنامہ ۱۹۸۷ء از انورسدید

۴۔ اُردوسفرناموں کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۹۵ء از خالدمحمود

اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar
Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232
www.uou.ac.in email: info@uou.ac.in
Toll Free No: 1800 180 4025

https://www.youtube.com/@91.2fmhellohaldwani7

اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی کا عوامی ریڈیو جس کے ذریعہ طلبا کے لئے مفید پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

https://www.youtube.com/@uoulive

MAUL - 609-1(004247)